مجاز، سوانح، شخصیت اور شاعری
محمد حسین دیپک شکوہ آبادی ایم۔اے علیگ

HaSnain Sialvi

سوانح
شخصیت
اور
شاعری

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

محمد حسین دیبک شکوہ آبادی
ایم۔ اے (علیگ)

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

تعداد ——————— ۶۰۰

اشاعت ——————— ۱۹۸۰ء

مطبع ——— علی گڑھ پریس محمد علی روڈ علی گڑھ

قیمت ——— لائبریری ایڈیشن پچیس ۲۵ روپے

:- کتاب ملنے کا پتہ :-

علی گڑھ پریس محمد علی روڈ
علی گڑھ

(اردو اکیڈمی اتر پردیش لکھنؤ کے مالی اشتراک سے شائع کیا)

HaSnain Sialvi

فہرس

HaSnain Sialvi

پیش لفظ

پیش نظر مقالہ کو محمد حسین دیبک نے اپنے ایم۔ اے فائنل کے امتحان کے لئے ۱۹۶۵ء میں تیار کیا تھا۔ یہ مقالہ میری نگرانی میں لکھا گیا ہے اور مجھے اس کے تمام اجزاء کو بڑی جزرسی کے ساتھ دیکھنے اور ان کے بارے میں مشورہ دینے کا موقعہ ملا ہے اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ محمد حسین دیبک نے بڑے ذوق و انہماک اور بڑی محنت و کاوش سے اپنا مقالہ مرتب کیا ہے۔

نئی اردو غزل میں جگر کے بعد جو شہرت اور مقبولیت جواں مرگ مجاز کو حاصل ہوئی وہ کسی اور شاعر کے حصہ میں نہیں آئی اور غزل کی نوجوان نسل پر مجاز کے آہنگ کا جتنا اثر ہے کسی دوسرے شاعر کا نہیں۔ اس کا ایک بہت کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ہر سال مجاز کا دن یکساں ذوق و ولولے کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ اور انکی شخصیت اور انکی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر چھوٹے بڑے مضامین لکھے جاتے ہیں۔ اردو رسالے مجاز کے خاص نمبر نکالتے رہتے ہیں لیکن اب تک مجاز پر کوئی مربوط اور منضبط کتاب شائع نہیں ہوئی۔ محمد حسین کے مقالے کی اہمیت یہی ہے کہ وہ مجاز کی شخصیت اور انکی شاعری کی مکمل تصویر سامنے لاتا ہے۔ مجاز پر جتنا تنقیدی ادب متفرقات کی شکل میں اب تک شائع ہوا ہے محمد حسین دیبک نے ان سب کا عرق ریزی کے ساتھ مطالعہ کر کے اپنے مقالے کیلئے مواد اکٹھا کیا ہے اسکے علاوہ علی گڑھ اور لکھنؤ میں مجاز کے عزیزوں اور ان دوستوں سے مل کر جن کو مجاز سے قرب حاصل رہا ہے اپنے مقالے کیلئے کچھ نئے عناصر حاصل کئے ہیں اور ان سب کو قاعدہ کے ساتھ مقالے کی شکل میں ترتیب دیا ہے

پروفیسر مجنوں گورکھپوری

یہ مقالہ کوئی ضخیم کتاب نہیں ہے۔ کل تین باب ہیں، لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس میں سوانح اور شخصیت سے لیکر شاعری تک اور شاعری سے لیکر لطیفوں تک مجاز کی پوری ہستی کو اجاگر کرنے کی سنجیدہ اور مخلصانہ کوشش کی گئی ہے۔ مجاز نے کس ماحول میں آنکھ کھولی اور کن حالات اور موثرات میں انکی تربیت ہوئی، ان کے کردار اور مزاج کی تشکیل میں کن عوامل نے حصہ لیا غرض کہ مجاز جو کچھ ہوئے وہ کیوں اور کیسے ہوئے؟ ان سب سوالوں کا جواب بغیر طوالت کے آپکو پہلے باب میں مل جاتا ہے۔ دوسرے باب میں مجاز کے مزاج کی غنایت اور انکی غزل سرائی کے ممتاز ترین خصوصیات کا تجزیہ ملے گا جو واضح اور کافی ہے۔ مجاز کی ایک امتیازی خصوصیت انکی برجستہ لطیفہ گوئی تھی جو ان کے حلقہ احباب میں بہت معروف اور مقبول تھی۔ مقالے کے تیسرے باب میں منتخب مثالوں کے ساتھ مجاز کے اس پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے۔ ان تینوں ابواب کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اختصار کے باوجود مجاز کی زندگی، انکی شخصیت اور ان کی شاعری کے تمام اہم عناصر کی تمام خصوصیت سامنے آگئی ہے اور کوئی رُخ ایسا نہیں ہے جو نظر سے پوشیدہ رہ گیا ہو۔

مختلف ذرائع سے جو مواد اور معلومات حاصل کئے گئے ہیں ان کو اس مقالہ میں نہ صرف ترتیب اور ربط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے بلکہ لکھنے والے کو مجاز اور مجاز کی شاعری سے جو ذاتی شغف ہے اس کے تقاضے کے مطابق جابجا شاعر کی شخصیت اور شاعری دونوں کے بارے میں ذاتی رائے بھی دی ہے۔

مجاز اور انکی شاعری پر بکھرے ہوئے مضامین تو بہت ملیں گے لیکن اس پُرخلوص محنت اور ذاتی لگاؤ کے ساتھ مرتب کیا ہوا مقالہ شاید ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا۔ یہ مقالہ اس کمی کو پورا کرتا ہے اور ایسا ہے کہ عام دلچسپی اور خاص شوق رکھنے والوں میں یکساں طور پر پسند کیا جائیگا۔ یہ مقالہ اگر جلد شائع ہو جائے تو مجاز پر اس وقت تک جو ادب ملتا ہے اس میں یقیناً ایک نیا اضافہ ہوگا۔

مجنوں گورکھپوری

HaSnain Sialvi

تقریظ

مجاز اپنی جس شاعری کی بدولت کسی زمانے میں مقبول اور ہر دلعزیز ہوئے وہ دراصل پر تو ہے اُس شخصیت کا جو اپنے اندر "افسانہ" بلکہ "دیو مالا" بننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ مجاز کے اس رومانی کردار سے لوگوں کی دلچسپی اس قدر بڑھی کی انھیں اُردو شاعری کا کیٹس، شیلی، بائرن اور نہ جانے کیا کیا سمجھا گیا۔

مجاز کی شاعری کی فنی قدر و منزلت کیا ہے اور آئندہ اس میں اضافہ ہوگا یا کمی اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کی نظموں اور غزلوں کی مناسب تفہیم اور تحسین کے لئے اُس پس منظر کو فراہم کیا جائے جو اُن نظموں کا اصل محرک ہے۔ مجاز کی زندگی کے نشیب و فراز کا باضابطہ مطالعہ کئے بغیر ان کی شاعری کا مناسب تجزیہ ممکن نہیں۔

محمد حسین دیگ نے اپنے مقالے میں دراصل اس بات کی کوشش کی ہے۔ یہ مقالہ انھوں نے مجاز کی وفات سے چند سال بعد ایم۔ اے کے طالب علم کی حیثیت سے لکھا تھا خوش قسمتی سے انھیں حضرت مجنوں گورکھپوری جیسے دیدہ ور نقاد کی رہنمائی نصیب ہوئی۔ یہ مقالہ انھوں نے بڑی لگن اور شوق کے ساتھ مرتب کیا تھا اور اس سلسلے میں سارے متعلقہ مواد کو سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ افسوس ہے کہ چند در چند اسباب کی بنا پر اب تک اس مقالے کی اشاعت نہ ہو سکی لیکن بڑے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اب بھی یہ مقالہ مجاز کے کلام کو سمجھنے سمجھانے کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی (مرحوم)

موت اعظمی کو لے گئی آخر | فکر و فن کا حسین پیکر تھا
باغِ اُردو پہ جب گری بجلی | جون انیس سو اٹھہتر تھا

شرمندۂ غم: دیپک شکوہ آبادی
۱۹۷۸ء

محمد حسن مرحوم

HaSnain Sialvi

اپنے برادر بزرگ

محمد حسن مرحوم

کی یاد میں

جن کی نوازشیں اور ہدائتیں

حصولِ علم کے لئے

مشعل راہ ثابت ہوتی رہیں

عرضِ حال

زیرِ نظر مقالہ مجاز سوانح شخصیت اور شاعری۔ اُردو اکاڈمی لکھنؤ کے تعاون سے کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہ مقالہ میں نے ۱۹۶۵ء میں ایم۔ اے فائنل کے امتحان کے لئے استاد محترم پروفیسر مجنوں گورکھپوری صاحب کی نگرانی میں مکمل کیا تھا۔

اس میں مجاز کے حالات زندگی اور شاعرانہ صلاحیتوں کو بڑی حد تک اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجھے توقع ہے کہ مجاز سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے یہ کتاب کارآمد ثابت ہوگی۔

مجاز کے اعزہ کے علاوہ اس مقالہ کی ترتیب وتکمیل کے سلسلہ میں پروفیسر آل احمد سرور۔ پروفیسر خورشید الاسلام۔ پروفیسر محمد محسن قریشی۔ پروفیسر اختر انصاری۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی۔ ڈاکٹر معین احسن جذبی۔ ڈاکٹر منظر عباس اور لفٹیننٹ ایم۔ اے قریشی کا شکر گزار ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور میری ہمت افزائی فرمائی۔

محمد حسین دیپک شکوہ آبادی

ایم۔ ایچ۔ دیپک شکوہ آبادی۔ ایم۔ اے۔ علیگ

سنوار آئے ہیں زلفِ آدمیّت
جہاں تک ہاتھ پہونچے ہیں ہمارے

دیپک شکوہ آبادی

مجاز

سوانح اور شخصیت

مجاز کی ایک نایاب تصویر (۱۹۴۸ء)

HaSnain Sialvi

اودھ کے مشہور قصبے ردولی کی زیادہ تر آبادی زمینداری کے خاتمہ سے پہلے زمینداروں اور تعلقداروں پر مشتمل تھی۔ وہاں کے ماحول میں جاگیردارانہ نظام کی تمام خوبیاں اور خامیاں سمٹی ہوئی تھیں لیکن تہذیب و معاشرت کی سطح بلند تھی۔ وہاں کی زندگی میں لکھنؤ کی نفاست اور خوش مذاقی سرایت کیے ہوئے تھی۔ لوگوں میں مل جل کر رہنے کا ایک سلیقہ تھا۔ خاطر تواضع اور مہمان نوازی میں خلوص تھا۔ پرانی روایات کی پاسداری ان کے کردار و مزاج اور ان کی زندگی کا ایک ترکیبی جز بن گئی تھی۔ رسم و رواج کی پابندی مذہبی عقیدے کی منزل تک پہونچی ہوئی تھی۔ شادی یا غم کے موقع پر دھوم دھام کی تقریب کا ہونا ضروری تھا اور ہر تہوار پر ساری برادری میں حصہ تقسیم ہونا لازمی تھا۔

اس چھوٹے سے پرسکون اور پرفضا قصبے کے زمینداروں میں چودھری احمد حسین جو مجاز کے دادا تھے متوسط درجہ کے زمیندار تھے۔ چودھری صاحب اسلامی عقائد کے قائل اور امام ابو حنیفہ کے پیرو تھے۔ یہ اپنی مخصوص وضع رہن سہن رکھ رکھاؤ اور حسن سلوک کی وجہ سے تمام قصبہ میں مشہور اور معزز تھے۔

ان کے سات اولاد ہوئیں۔ جن میں چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔
یہ سب کے سب ذہین اور ہونہار تھے۔ معاملہ فہمی اور کارگزاری میں اس
خاندان کی لڑکیوں کو قصبہ بھر میں امتیاز حاصل تھا۔ جہاں تک تعلیم و
تربیت کا سوال ہے وہی پرانا طریقہ یعنی مسجد کے مکتبوں کا رواج تھا خوشحال
گھرانوں میں مولوی رکھے جاتے تھے۔ عربی فارسی اور ریاضی سے اتنی واقفیت
کافی سمجھی جاتی تھی کہ زمینداری کے کام سلیقہ سے چلائے جا سکیں۔ یہ تھا
اس وقت کا معیار تعلیم جس سے اہل ردولی کے کردار و مزاج کی تکمیل ہوئی۔

چودھری صاحب کی سات اولادوں میں سے دو یعنی چودھری سراج الحق
جو مجاز کے والد تھے اور ان کے بڑے بھائی جن کا نام نواب حسن فوق تھا
یہ دونوں بچپن ہی سے کچھ مختلف اور غیر معمولی طبیعتوں کے مالک تھے۔
سراج کے بڑے بھائی بے حد لاابالی، رنگین مزاج اور آزاد منش تھے۔ وہ
شاعر بھی تھے اور اچھے شعر کہتے تھے۔ لیکن سراج ان کے بالکل برعکس سنجیدہ
بردبار کم سخن محنتی اور مرنجاں مرنج انسان تھے طبیعت پر تصوف کا
رنگ غالب تھا۔

چودھری صاحب کو ان دونوں ہی کی طرف سے پریشانی تھی۔ بڑے
صاحبزادے تو قابو میں نہ آ سکے۔ چودھری صاحب کی زندگی میں تو چھپ
چھپ کر اور ان کے انتقال کے بعد کھلم کھلا عیش و نفاست کی زندگی میں
جائداد اڑادی۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے سراج الحق دنیاداری میں پھنسا
دئے گئے۔ چودہ سال کی عمر میں چچازاد بہن سے شادی ہو گئی لیکن پھر بھی
سراج الحق کی علم دوستی میں فرق نہیں آیا۔ اتفاق سے اس زمانے میں ایک
تعلقدار گھرانے میں فیض آباد سے آئے ہوئے ایک بڑے انگریزی داں استاد

رکھے گئے۔ سراج الحق نے ان سے استفادہ کیا اور اپنی کوشش و محنت سے میٹرک پاس کرلیا۔

سراج الحق کا میٹرک پاس کرنا قصبے بھر میں اپنی نوعیت کا پہلا کارنامہ تھا۔ ان کی اس کارگزاری و کامیابی سے چودھری صاحب کا حوصلہ بڑھا اور سراج الحق مزید تعلیم کے لئے لکھنؤ بھیجے گئے۔ انھوں نے کچھ اپنی کاوش اور کچھ گھر والوں کی مدد سے تعلیم جاری رکھنے کا انتظام کیا اور بی۔ اے اور ایل ایل بی کی سندیں حاصل کیں۔ آخر کار فارغ التحصیل ہوکر لکھنؤ میں سرکاری ملازم ہوگئے یہ ردولی کے پہلے شخص تھے جنھوں نے زمینداری کے باوجود ملازمت اختیار کی۔

اگرچہ سراج الحق اپنے خاندان اور اپنے وطن میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے لیکن ان کی روش اور عادات و اطوار میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی وہ نیک نیت کم سخن اور حقیقت پسند ہمیشہ رہے طبیعت میں ٹھہراؤ اور استقلال کے علاوہ ارادے کی پختگی تھی۔ ان کی رفیقہ حیات مجاز کی والدہ اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بالکل ان پڑھ لیکن بہت تیز۔ ذہین زمانہ شناس۔ طبعاً شوقین اور تفریح پسند تھیں۔ مزاج جذباتی پایا تھا۔

سراج الحق کی اولاد میں سب سے بڑے ابرار الحق تھے۔ یہ اٹھارہ سال کی عمر میں درخت سے گرکر انتقال کر گئے۔ ان کے بعد ان کی بہن عارفہ خاتون پیدا ہوئیں یہ ۱۹۵۱ء میں دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ عارفہ خاتون کی پیدائش کے بعد ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ماں کے دامن میں ایک ایسا پھول آیا جس کی مہک نے گلشن شاعری کو تروتازگی بخشی اور اردو شعر و

ادب میں انگریزی کے مشہور جوان مرگ شاعر کیٹس کی یاد تازہ کی۔ اور جو شہید رومانیت اور جان بزم دلبران کے خطاب سے بھی مشہور ہوا۔ اس نوزائدہ غنچہ کا نام اسرار الحق رکھا گیا اور گھر والوں نے اس کو پیار میں جگن بھی کہا۔ لیکن جب یہ غنچہ پھول بنا تو مجاز کے نام سے مشہور ہوا اور ۴۵ سال کی عمر تک اپنی خوشبو سے شاعری کی دنیا کو مہکاتا رہا۔ مجاز کی پیدائش کے بعد انصار الحق صفیہ اور حمیدہ نے اس دنیائے آب و گل میں آنکھ کھولی۔ انصار شروع ہی سے بڑے عملی قسم کے تھے۔ انھوں نے کانگریس کی عملی جد وجہد میں بڑا حصہ لیا اور اب تک لکھنؤ میں ایک سرگرم سیاسی کارکن ہیں۔ صفیہ علی گڑھ گرلس کالج میں لیکچرر تھیں۔ ان کی شادی جان نثار اختر سے ہوئی ۱۹۵۳ء میں وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئیں حمیدہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ اقتصادیات کے استاد جناب ابوسالم صاحب سے منسوب ہوئیں اور اب تک علی گڑھ میں ہیں۔

اسرار الحق مجاز کی پیدائش سے قبل ایک بچہ دو ڈھائی سال کی عمر میں ضائع ہو چکا تھا۔ اس لئے مجاز کی پیدائش مبارک سلامت کی نیک صداؤں کے ساتھ ہوئی۔ یہ بہت لاڈ و پیار اور منت و مراد سے پالے گئے۔ محرم کی ساتویں تاریخ کو فقیر بنتے اور دسویں کو پایک بنائے جاتے۔ ایک کان میں بندا پڑا ہوا تھا جو چھ سال کی عمر میں اجمیر لے جا کر اتارا گیا۔ ان کے ہر دکھ اور بیماری پر صدقے اترتے اور خیراتیں ہوتیں۔ مجاز جب نو یا دس سال کے ہوئے تو ان کے بڑے بھائی ابرار الحق درخت سے گر کر مر گئے۔ اس حادثہ کے بعد سارے گھر کی محبت امنڈ کر مجاز پر مرکوز ہو گئی۔ ان کی دل لبھانے والی معصوم شوخیوں اور شرارتوں نے

سب کو گرویدہ کر لیا ماں اور نانی انہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتیں اور ہر وقت تمام حوادث وخطرات سے بچانے کی فکر میں لگی رہتیں ان کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لئے ایک نوکر مقرر تھا۔ عمر کے آخر تک کوئی صبح ایسی نہ گزری جب ماں نے ان کی زندگی کے لئے دو رکعتیں شکرانہ کی نہ پڑھی ہوں۔ ایک عرصہ دراز تک ان کے سرہانے دو آنے رکھے جاتے رہے جو صبح کو خیرات کر دئے جاتے تھے۔ ان کی ہر سانس کے ساتھ ماں کی دعائیں اور ہر قدم کے ساتھ مرادیں اور آرزوئیں وابستہ تھیں۔

جاگیر دارانہ ماحول میں پیدا ہونے اور پرورش پانے کے باوجود مجاز قطعاً بے نیاز اور لاابالی رہے۔ طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ ہر وقت ایک نہ ایک نئی شرارت کا آغاز ہوتا رہتا تھا۔ بہنوں سے چھیڑ چھاڑ کھلونوں کی توڑ پھوڑ ان کی اندرونی ماہیت کی تفتیش کرنا گلی ڈنڈا اور دھول دھپا ان کے محبوب مشغلے تھے۔ دوسروں کی چیزیں بے تکلف اپنے تصرف میں لے آنا اور اپنی چیزیں دوسروں کو دیدینا ان کی عادت تھی۔ نوکروں چاکروں سے برادرانہ برتاؤ رکھتے تھے۔ "شرف الدین" جو کہ ان کے گھر کا پلا ہوا ملازم تھا اس سے ان کی بڑی گہری دوستی تھی۔ ان کا ایک کان بھی خراب رہتا تھا۔ اس لئے ذرا اونچا سنتے تھے۔ اس باعث ان کے ماموں اور چچا ان کو "بہرے او سڑے او" کہتے تھے۔ کچھ عزیز سنکی بھی کہتے تھے مجاز کے یہ گھریلو خطابات سولہ سترہ سال کی عمر تک رائج رہے۔ یہ شوخ شریر اور بے خبر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین بھی تھے۔ پڑھائی میں ہوشیار اور حساب میں بہت تیز تھے۔ ہم جماعت طالب علموں میں ایک نمایاں حیثیت تھی۔ اور ہاکی کے بھی بہت اچھے کھلاڑی تھے۔

مجاز نے ماں اور باپ دونوں کے خصوصیات کا ملا جلا رنگ پایا تھا۔ باپ کی طرف سے نیک نیتی۔ کم سخنی۔ حقیقت پسندی اور طبیعت کی گہرائی پائی۔ ماں کی طرف سے طبیعت میں حسن پرستی اور اثر پذیری ملی۔ لاابالی پن اور بے خبری شاید چچا سے پائی۔ کاش انھوں نے باپ کی طبیعت کا ٹھہراؤ۔ استقلال اور ارادے کی مضبوطی بھی پائی ہوتی۔ لیکن ان کی زندگی کے شیرازہ کو تو بکھرنا تھا۔

صورت شکل کے اعتبار سے مجاز میں کوئی دلکشی نہیں تھی لیکن ان کا مزاج شگفتہ تھا جو دوسروں کے اندر بھی شگفتگی پیدا کر دیتا تھا۔ یہ ان کی سیرت کا بہت بڑا حسن تھا۔ اس لئے وہ سب ہی کے محبوب تھے۔ ان کی معصومیت لوگوں کو بہت زیادہ متاثر کرتی تھی۔ اسی معصومیت اور بھولے پن کے ساتھ ان کی لطیفہ گوئی اور فقرہ تراشی بھی قیامت کی تھی جو ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر محفل اور ہر انجمن میں سب سے زیادہ نمایاں رہتے تھے۔

مجاز کی ابتدائی تعلیم ردولی کے ایک مکتب میں ہوئی میٹرک امین آباد ہائی اسکول سے پاس کیا۔ اس زمانے میں ان کے والد کا تبادلہ آگرہ ہو گیا اور مجاز نے ۱۹۲۹ء میں سینٹ جانس کالج میں ایف۔ ایس سی میں داخلہ لیا۔ انجینیرنگ لائن اختیار کرنے کے خیال سے مضامین میں (ریاضیات) کا انتخاب کیا۔ آگرہ کے دوران قیام میں مجاز کو ٹروس فانی بدایونی کا ملا اور کالج میں معین احسن جذبی جو اس وقت اپنا تخلص ملال کرتے تھے اور آل احمد سرور کا ساتھ رہا جو مجاز سے ایک سال سینیر تھے۔ یہاں مجاز کو ٹینس سے خاص دلچسپی ہو گئی اس باعث وہ سیکنڈ ٹیم کے ممبر بھی ہو گئے تھے۔

ان کی طبیعت کا فطری رجحان جو اپنا صحیح راستہ اختیار کرنے کے لئے بےچین تھا ان کو شاعری کی طرف لے گیا۔ یہاں مجاز نے جو اپنا پہلا تخلص اختیار کیا اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ "مجاز ایک آہنگ" کے مرتب صہبا لکھنوی نے ان کا پہلا تخلص اسیر لکھا ہے اور ان کی پہلی غزل جو بتائی ہے اس کا مطلع یہ ہے۔

حسن کو بے حجاب ہونا تھا
شوق کو کامیاب ہونا تھا

لیکن مجاز کا کلام جو "آہنگ" کے نام سے" دانش محل لکھنؤ" اور "آزاد کتاب گھر" دہلی سے کتابی صورت میں شائع ہوا اس میں مجاز کی اس غزل کا مقطع یہ ہے

رات تاروں کا ٹوٹنا بھی مجاز
باعث اضطراب ہونا تھا

اس مقطع میں ان کا تخلص مجاز ہی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اسیر اور مجاز ہم وزن ہونے کے لحاظ سے مجاز نے اس غزل میں اپنا تخلص بجائے اسیر کے مجاز کر دیا ہو۔ مجاز کے پرانے ساتھی ڈاکٹر معین احسن جذبی کا کہنا ہے کہ مجاز کا پہلا تخلص شہید تھا اور شہید کے مقطع سے جو انھوں نے غزل کہی تھی اس کا مطلع جذبی صاحب کے کہنے کے بموجب یہ تھا

پریشان ہو گئی جب زلف قاتل
اندھیری ہو گئی دنیائے بسمل

یہ غزل مجاز کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ بعد میں فانی کے مشورہ سے انھوں نے اپنا تخلص مجاز اختیار کیا اور اسی تخلص سے حلقۂ شعر و ادب

ہیں مشہور ہوئے۔

اس دور میں جذبی فانی اور بیکش اکبرآبادی سے ربط وضبط بیکار نہیں گیا۔ روز و شب کی صحبتیں اپنا اثر دکھلانے لگیں۔ اسی دور میں فانی نے ان کی چند غزلوں پر اصلاح بھی کی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ بہت جلد مجاز کی خود اعتمادی نے اپنے ذوق ہی کو اپنا رہبر قرار دیا۔ مجاز کی زندگی کا پہلا موڑ ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ جبکہ انہیں سینٹ جانس کالج آگرہ کے بورڈنگ کی زندگی نصیب ہوئی۔ منچلے دوستوں کا ساتھ شروع ہوا۔ گھر کے قید و بند سے آزاد ہوئے۔ اب شاعری کا جنون اپنے شباب پر تھا۔ رات رات بھر شعر و شاعری کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ پڑھائی میں ابتری پیدا ہونا شروع ہوگئی۔ زندگی کا نظام درہم برہم ہونے لگا۔ امتحان کے ایام میں بھی یہ جنون کم نہ تھا۔ بلکہ اور بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ راتوں کو مشاعرے ہوتے اور صبح کو امتحان گاہ میں کاپیاں صاف لوٹا دی جاتیں۔ اس صورت حال سے انھوں نے ۱۹۳۱ء میں کالج کے انعامی مقابلے کے مشاعرے میں پہلا انعام تو ضرور حاصل کرلیا مگر امتحان میں ناکام رہے مجاز کی اس روش سے ان کے گھر والے پریشان ہوئے اور پھر مجاز کو تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیجا گیا۔ جہاں کی فضا حسرت اصغر اور جگر جیسے باکمال شعرا کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ یہاں آکر مجاز نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ بی۔ اے میں ان کے مضامین فلسفہ۔ معاشیات اور اردو تھے۔ مسلسل دو سال کی غیر حاضری کی کمی کے سبب سے امتحان میں شریک نہ ہوسکے اور ۱۹۳۵ء سے پہلے بی۔ اے نہ کرسکے۔ اس کے

ایک یادگار گروپ

کھڑے ہوئے :- ساحر لدھیانوی - مجاز - آفتاب عالم -

بیٹھے ہوئے :- باقر مہدی - خلیل الرحمن اعظمی - انجم اعظمی -

(علی گڑھ سنہ ۱۹۴۹ء)

بعد ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ لیکن اس زمانہ میں مجازؔ کا زیادہ تر وقت دوستوں کے کمرہ پر گذرتا تھا جن میں جاں نثار اختر۔ اختر امام سردار جعفری۔ سبط حسن اور حامد جو ٹینس کے اچھے کھلاڑی تھے، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان دوستوں کے حلقہ کے علاوہ اور پرانی روایتوں کے خلاف جبکہ مجازؔ ایم۔ اے پریوس کے طالب علم تھے۔ علی گڑھ اردو میگزین کے ایڈیٹر بھی منتخب ہوئے۔

مجازؔ کا یہ علی گڑھ کا دور ادبی زندگی اور سیاسی وسماجی شعور کی تربیت کے لحاظ سے بڑا اہم دور ہے۔ علی گڑھ کی اقامتی زندگی کی شہرت اور کامیابی کا راز خوش باشی اور خوش مذاقی میں مضمر تھا۔ اس وجہ سے جو علی گڑھ میں رہتے اور بستے تھے وہ بھی اپنے بچوں کو ہوسٹل میں کچھ وقت گذارنے کے لئے بھیج دیتے تھے اور مجازؔ تو یہاں کے طالب علم تھے۔ ان کا زیادہ وقت اردو سرکل میں دوستوں کے ساتھ گذرتا تھا۔ لیکن ان کا چھوٹا سا خاندان جوان کی بہن صفیہ اور بھائی انصار الحق پر مشتمل تھا۔ وہ میرس روڈ پر رہتا تھا۔ جس کو سول لائن بھی کہا جاتا ہے۔ مجازؔ کے یہ دونوں بہن بھائی بھی یہاں تعلیم پا رہے تھے۔ میرس روڈ کے اس علاقہ میں سب شائستہ اور تہذیب یافتہ لوگ رہتے تھے۔ گرلس کالج اور گرلس کالج کے ہوسٹل کے قریب رؤسا اور یونیورسٹی کے اساتذہ کی کوٹھیاں تھیں۔ یہاں کی فضا شہر کی فضا کے برعکس حسن پرور اور رومان انگیز تھی۔ اس رنگین اور حسن پرور فضا کے سایہ میں بہت سے صنم کدے بھی تھے اور ان کے طواف کرنے والے بھی۔ شائستہ مذاق رکھنے والے نوجوانوں کے لئے یہ علاقہ رنگینیوں اور رعنائیوں کے لحاظ سے

فردوسِ حسن بن گیا تھا۔ یہاں کی ہر شام شامِ اودھ اور ہر شب شبِ شیراز سے کم نہ تھی۔ اس فردوسِ حسن کی رومان پرور فضا میں مجاز کا ذوقِ شاعری پروان چڑھا۔ یہیں انھوں نے سنہرے خواب دیکھے اور یہیں پہلے پہل ایک زہرہ جبیں ان کی زندگی میں داخل ہوئی۔ جس نے ان کی شاعری کو کیف و سرور اور ان کے نغموں کو سوز و گداز بخشا۔ اس نے ان کے تصور کی دنیا کو حسین سے حسین تر کر دیا۔ "محبت" جس کے مجاز مشتاق تھے وہ ان کو نہ دے سکی اور ان کی زندگی سے دور ہو کر ایک دولت مند سے شادی کر کے دلّی چلی گئی۔ اس کا اثر مجاز پر آخر وقت تک رہا۔ اسی دوران میں دسمبر ۱۹۳۲ء میں انجمن حدیقۃ الشعر کا سالانہ مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت سر راس مسعود وائس چانسلر نے کی تھی۔ اس مشاعرہ میں مولانا حسرت۔ اصغر گونڈوی۔ اور حفیظ جالندھری بھی شریک تھے۔ طلبا کے لئے نظم کا ایک عنوان "صبح بہار" رکھا گیا تھا۔ مشاعرہ میں مجاز بھی شریک ہوئے اور حسب معمول ان کی نظم پر شروع میں ہوٹنگ ہوئی مگر بہت جلد نظم کی رنگینی و دلکشی اور پڑھنے والے کے پُر سوز ترنم نے لوگوں کو متوجہ کر لیا۔ یہ مجاز کا علی گڑھ سے پہلا تعارف تھا۔ اس کے علاوہ علی گڑھ یونین ہال سے مجاز کی جو نظمیں پہلی بار سنی گئیں ان میں نذرِ خالدہ۔ نذرِ علی گڑھ۔ نورا۔ نمائش اور انقلاب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ترکی کی مشہور مجاہد خاتون ادیب خانم نے اپنی تقریر میں مجاز کی تعریف بھی کی تھی۔

۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء کا یہ زمانہ جبکہ پروفیسر آل احمد سرور علی گڑھ اردو میگزین کے ایڈیٹر تھے۔ میگزین میں مجاز کی دو نظمیں نمائش اور انقلاب

اور ایک غزل شائع ہوئیں۔ اس دور میں مجاز کالج میں ایک مخلص دوست اور زندہ دل رفیق کی حیثیت سے ممتاز تھے۔ اور ہر وقت دوستوں کے حلقہ میں گھرے رہتے تھے۔ ان منچلے دوستوں کا محبوب مشغلہ اسٹیشن کی سیر اور نمائش کے ایام میں نمائش کا گشت ذوق نظر کی تسکین کے لئے مخصوص تھا۔ مجاز کی نظم نمائش اسی زمانہ کی تند و تیز والہانہ جذبات کی پہلی علامت ہے۔ اسی زمانہ میں مجاز کی شاعری کا صحیح طور پر آغاز ہوا۔ اور تین چار سال میں ان کی نظموں کی شہرت یونین ہال کی چار دیواری سے نکل کر سارے ملک میں پھیل گئی۔ اسی وقت علی گڑھ کے نوجوان شعراء میں مجاز سے زیادہ کوئی مقبول نہ تھا۔ ان کا شاعرانہ لاابالی پن ان کے مزاج پر غالب آچکا تھا اور وہ ہر وقت اپنا یا کسی اور کا کوئی نہ کوئی شعر گنگناتے رہتے تھے۔ ان کا ہلکا پھلکا پرسوز ترنم جس میں بلا کی نغمگی تھی سننے والے کے دلوں کو موہ لیتا تھا۔ اب علی گڑھ کے مشاعروں میں ترنم سے پڑھنے کا رواج عام ہو چکا تھا۔ علی گڑھ کی بزم سخن کے میر مجلس مولانا احسن مارہروی مرحوم اس کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے ساغر نظامی کے ترنم پر ایک طنزیہ قطعہ برسر مشاعرہ پڑھا تھا۔ لیکن جگر کے والہانہ انداز نے نوجوان شعراء میں ترنم کا شوق پیدا کر دیا تھا۔ سردار جعفری بیشک تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ لیکن مجاز جذبی اور جاں نثار اختر نے شروع ہی سے ترنم اختیار کیا۔ اختر کی آواز ترنم کے لیئے خاص موزوں نہ تھی۔ جذبی کے ترنم میں سوز تھا اور مجاز کے یہاں نغمگی اور دل آویزی تھی۔ جذبی جب پڑھتے تھے تو مجسم سوز بن جاتے تھے اور مجاز مجسم نغمے میں ڈھل جاتے تھے۔ ان کے پتلے پتلے ہونٹوں

پر تبسم کھیلتا رہتا تھا۔ والہانہ انداز میں اپنے بالوں کو سنوارتے جاتے تھے اور بے خودی کے عالم میں جھومتے رہتے تھے۔ ان کی آواز باریک تھی لیکن اثر انگیز اور تیز تھی۔ ان کے پڑھنے کا اپنا ایک مخصوص انداز تھا۔ اس کے ساتھ ان کے لباس اور ان کی وضع و قطع میں بھی ایک شاعرانہ وارفتگی تھی۔ ان کا میانہ قد۔ چھریرا جسم۔ سانولا رنگ۔ اس پر سیاہ رنگ کی سمور کی ٹوپی علی گڑھ کٹ پاجامہ اور شیروانی اس مختصر سے لباس میں لاپروائی کے باوجود ایک نفاست اور ایک ستھرا پن ہوتا تھا ان کی مخمور سیاہ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور دلکشی تھی۔ ان کے فقروں اور ان کے لطیفوں نے ان کو بہت زیادہ ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ کالج کے ہر گوشہ میں اور ہر ایک ہوسٹل میں مجازہی کا چرچا رہتا تھا۔

اسی زمانہ میں علی گڑھ میں خیالات کی اک نئی رو شروع ہوئی اور اک گروہ بنا جس میں سردار جعفری۔ سبط حسن۔ جاں نثار اختر اور مجاز بھی شامل تھے۔ یہ گروپ یونیورسٹی میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا اور اس گروپ کا ہر فرد اک مخصوص فن کا مالک تھا ان میں کوئی اچھا مقرر تھا کوئی چوٹی کا ادیب اور کوئی محبوب شاعر اور سب اپنے اپنے نئے ہتھیاروں سے مسلح پرانے اور فرسودہ نظام سے برسر پیکار رہتے۔ اور نئی قدروں کو فروغ دینے کی دھن میں محو تھے۔ علی گڑھ کے اس نئے پیدا ہونے والے شعور کی رفتار کبھی کبھی حد سے تجاوز کر جاتی تھی اور مقرر کی تیز زبانی لوگوں کو بار خاطر ہو جاتی تھی۔ ادیب کے قلم کی روانی میں دلخراش پہلو پیدا ہو جاتے تھے لیکن شاعر دلوں کا رازدان روح کا پیامبر ہوتا ہے۔ اس کی بولی میں رس اور مٹھاس ہوتی ہے۔ اس کا پیغام پرخلوص اور اثر انگیز ہوتا ہے۔

اور پھر مجاز جیسا شاعر جس کے یہاں بقول فیض احمد فیض "شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گداز دونوں ہیں۔"

مجاز کالج میں استادوں کے منظورِ نظر اور طلبا کے لئے باعثِ فخر تھے۔ گرلس کالج میں ہر زبان پر ان کے اشعار تھے۔ عورت کو نکتہ داں بتانے والا شاعر لڑکیوں کی نظروں کا مرکز فکر اور ذہن کا محور اور تصور کی جان بن گیا۔

اب مجاز شہرت کی بام عروج پر تھے۔ ان کا کلام اخبار اور رسائل میں شائع ہو رہا تھا۔ اکثر نوجوان ان کے اشعار انہی کے انداز میں پڑھتے اور لطف لیتے تھے۔ مشاعروں میں مجاز کا عالم اس سے بھی سوا تھا۔ جس مشاعرے میں شریک ہوتے تھے اسے لوٹ لیتے یا اس پر چھا جاتے۔ مجاز کو خود اپنی مقبولیت کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ شعر و شاعری میں محو ہو کر نصابی زندگی سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

۱۹۳۵ء میں جب آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دلی میں قائم ہوا تو فیلڈن اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ جو اس سے پہلے آگرہ کالج آگرہ میں شعبہ انگریزی کے صدر تھے۔ انھوں نے ریڈیو میں تقریریں کرنے کے لئے رشید احمد صدیقی صاحب کو علی گڑھ سے اور پروفیسر بخاری کو لاہور سے بلایا۔ ابتدائی منشورات میں زیڈ۔ اے۔ بخاری آغا اشرف اور مجاز کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس تقریب کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے رسالہ "آواز" کی ادارت مجاز کے سپرد کی گئی۔ "مجاز ایک آہنگ" کے مرتب صہبا لکھنوی نے لکھا ہے کہ رسالہ کا نام "آواز" مجاز ہی نے تجویز کیا تھا۔ یہیں سے مجاز کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک سال تک وہ "آواز" کی سب ایڈیٹری کے فرائض

انجام دیتے رہے۔ وہاں ان کے ساتھ ان کا پرانا ملازم بھی تھا جو سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ مجاز ہر ماہ اپنی تنخواہ اس کے سپرد کر دیتے تھے اور کبھی یہ نہ پوچھتے تھے کہ کب اور کس طرح صرف ہوئی۔ ان کا گھر ٹھہرنے والوں کا ڈیرا بنا رہتا تھا۔

مجاز کو شراب کی لت طالب علمی کے زمانے میں لگ چکی تھی۔ دلی کے قیام نے ان کی رندی اور سرمستی کے رنگ کو اور بھی گہرا اور مستقل کر دیا۔ لیکن ابھی تک وہ شاعر محفل وفا اور مطرب بزم دلبراں کی حیثیت سے ممتاز تھے۔ ابھی وہ شراب میں اس طرح نہیں کھوئے تھے جس طرح کہ بعد میں کھو کر رہ گئے۔ وہ ابھی تک علی گڑھ کے شاعر تھے "دلی کے شرابی" نہ تھے وہ ادبی حلقوں میں اپنا اک مقام بنا چکے تھے۔ دلی کا قیام انہیں سازگار نہ ہو سکا۔ ان کی معصومیت فریب کاروں کا شکار ہوتی رہی۔ قسمت کی گردش اپنی نیرنگیاں دکھاتی رہی۔ اور نت نئے ناموافق حالات سے مجاز دوچار ہوتے رہے۔

کچھ عرصہ بعد پروفیسر بخاری کا فیلڈن کے نائب کی حیثیت سے دہلی ریڈیو اسٹیشن میں تقرر ہوا جس سے دہلی اور پنجاب والوں میں چشمک شروع ہوئی آغا اشرف نے مجاز کو اپنا ہمنوا کر لیا اسی یو۔پی اور پنجاب والوں کی رسہ کشی میں بخاری نے آغا اشرف کا تنزل کر دیا اور مجاز ملازمت سے برطرف کر دئیے گئے۔ روزگار کی چوٹ کے ساتھ ساتھ مجاز کے عشق پرور دل پر بھی ضرب لگی اور ایسی ضرب لگی جس کا زخم ان کی آخیر زندگی تک مندمل نہ ہو سکا بلکہ رفتہ رفتہ ناسور کی شکل اختیار کر گیا۔

حسن کے سودائی کا ہاتھ محبت کے نشہ میں بقول حمیدہ سالم "ایک شجر ممنوعہ کی طرف بڑھ گیا۔ دلی کے چوٹی کے خاندان کی اکلوتی بیٹی پہنچ....

.........البیلی اور خوبصورت لاڈ و پیار میں پلی ہوئی عیش و عشرت کی عادی .... ایک عدد بھاری بھرکم شوہر کی ملکیت یا مالک، جو کچھ سمجھئے .... یہ بیل منڈھے چڑھتی تو کیونکر"۔

آخر مجاز کی حسرتوں کا خون ہونا تھا اور خون ہو کر رہا۔ خوبصورت خوابوں کی تعبیر بھیانک نکلی اور محبت بھرا دل شکستہ ساز ہو کر رہ گیا۔ زندگی کے سریلے گیت گانے والا مجاز ۱۹۳۶ء میں دل شکستہ و پژمردہ اپنی خوشیوں کی میت اپنے کاندھے پر اٹھائے یہ کہتا ہوا دلی سے رخصت ہوا۔

رخصت اے دلی تیری محفل سے اب جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں نالہ بلب جاتا ہوں میں

دوسری طرف مجاز کے ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت کے دوران میں ان کی ماں اور بہن ان کی شادی کے منصوبے باندھ رہی تھیں۔ ایک خوبصورت سی دلہن کی تلاش جاری تھی۔ شادی کے انتظامات بڑے زور و شور سے ہو رہے تھے۔ نادنوں میراثنوں کے لئے لہنگے کرتیاں پاسیون کے لئے شال دوشالے خریدے جا چکے تھے۔ مگر یہ کسے معلوم تھا کہ یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔ آرزوئیں تشنۂ تکمیل ہی رہ گئیں شاعر اپنے خیالی تصور ہی سے ہمکنار رہے گا۔ محبت کے گیت گانے والے سے لوگ محبت تو کریں گے مگر دور سے اس کی دلدہی کریں گے مگر رسماً شادی کے مسئلہ پر نقرئی سکوں کے پجاری شاعر کے فن کو اہمیت نہ دے سکیں گے۔

مجاز کی ملازمت کیا ختم ہوئی گویا ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ ماں اور بہن کے

منصوبوں پر پانی پھر گیا۔ امیدوں کے چراغ جلنے سے پہلے بجھ گئے۔
اب مجاز تھے اور لکھنؤ کے ساغر میں ڈوبے ہوئے روز و شب اسی سال ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں ایک اردو کانفرنس ہوئی۔ مولوی عبدالحق صاحب انجمن کے دفتر کو دہلی منتقل کرنا چاہتے تھے اور انجمن کے کام کو بڑھانا بھی چاہتے تھے۔ یہ بڑا شاندار اجتماع تھا اس میں اردو کے جان نثاروں کو دعوت دی گئی تھی۔ اس دعوت میں مجاز بھی شریک تھے۔ مجاز جب اس اجتماع میں آئے تو ان کی ملازمت ختم ہو چکی تھی۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور "انھوں نے استفسار حال پر اقبال کا یہ شعر پڑھا تھا"

اگر لٹ گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

کانفرنس کے دوران میں یونین ہال میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا گیا۔ پنڈت کیفی نے "اردو ہماری زبان" کے نام سے ایک مقالہ پڑھا۔ کیفی کی آواز پست تھی مائک کا رواج نہ تھا اس لئے کیفی کا مقالہ بے کیفی کے ساتھ ختم ہوا اور صدر کے اعلان کے مطابق اسرار الحق مجاز نے اپنی نئی نظم "نذر علی گڑھ" اپنے مخصوص انداز سے دلنشیں اور پرسوز آواز میں شروع کی جس نے سامعین کو مبہوت کر لیا اور جب مجاز اس شعر پر پہنچے۔

"آگے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے"

تو ہر طرف سے نعرہ تحسین بلند ہوا۔ اس وقت ڈائس پر ڈاکٹر ذاکر حسین عبدالرحمٰن صدیقی اور مولوی عبدالحق صاحب تشریف فرما تھے۔ ذاکر صاحب نے بے ساختہ کہا "مجاز صاحب پھر پڑھئے" اس زمانے میں

علی گڑھ کے ارباب حل و عقد اولڈ بوائز پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ خلافت کے زمانے کی طرح پھر علی گڑھ کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ مجاز کے اس شعر میں اس کا جواب تھا۔

مجاز کی اس نظم نے صرف داد ہی حاصل نہیں کی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ان کو محبوب بنا دیا۔ یہ دور مجاز کی شاعری کا سنہرا دور کہا جا سکتا ہے۔ ان کی مقبولیت اپنے شباب پر تھی۔ دوستوں کی حوصلہ افزائی نازک اندا موں کی داد اور مشاعروں کی کامیابی نے ان پر ایک مکمل اور بھرپور شاعرانہ کیفیت طاری کر دی تھی۔

اسی زمانہ میں علی گڑھ کے ایک دولت مند آزاد خیال گھرانے کی نہایت تیز طرار لڑکی نے صفیہ کے ذریعہ مجاز سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجاز شاعری کے بام عروج پر تھے۔ شہرت ان کے قدم چوم رہی تھی ترقی کے نئے باب ہر قدم پر وا ہو رہے تھے۔ اس چڑھتے ہوئے نشے میں مجاز نے بڑی خوبصورتی سے یہ کہکر "صفیہ مجھے کاغذ کے پھولوں سے دلچسپی نہیں" اس پیغام کو رد کر دیا۔

مجاز علی گڑھ کانفرنس کی تقریب کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں کئی سال تک ان کا قیام رہا۔ اور لکھنؤ کے اس قیام نے مجاز کو جوش ملیح آبادی کے بہت قریب کر دیا۔ مجاز اکثر و بیشتر جوش کے ساتھ دیکھے جانے لگے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور "جوش کا فرض تھا کہ مجاز کو بہکنے نہ دیتے مگر قبلہ رندان جہاں کو اپنی ذمہ داری کا کب احساس تھا" رقص ساغر تیز سے تیز تر ہوتا گیا اور مجاز مست سے بدمست ہو گئے۔ یہاں ان کے حلقہ میں سردار جعفری۔ سبط حسن کے علاوہ جوش۔ حیات اللہ انصاری۔

ڈاکٹر عبد العلیم۔ احمد علی اور احتشام حسین بھی تھے۔ اس پورے گروپ میں سوائے جوش کے کوئی بھی بت خانہ شعر کا آذر نہ تھا۔ مگر یہ سب ترقی پسند تحریک کے حامی ایک سنجیدہ مقصد کو لے کر بڑھ رہے تھے۔ مجاز بھی روایتی طور پر ترقی پسند تحریک سے منسلک تھے۔ اور انھوں نے اس کا اثر بھی لیا۔

۱۹۳۸ء کے قریب مجاز کا پہلا مجموعہ کلام "آہنگ" کے نام سے لکھنؤ سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ "آہنگ" کا شائع ہونا تھا کہ مجاز کی شہرت میں اور بھی چار چاند لگ گئے۔ اور بقول عصمت چغتائی "نئی پود نے آہنگ کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور سینے سے لگایا تھا۔ مجاز کے نام پر گرلس کالج میں لاٹریاں ڈالی جاتی تھیں اور اس کے اشعار تکیوں کے نیچے چھپا کر آنسوؤں سے سینچے جاتے تھے اور کنواریاں اپنے آئندہ بیٹوں کے نام اسی کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں۔ نہ جانے کس ارمان کے بدلے۔"

لکھنؤ میں آکر بھی مجاز بجھے ہوئے سے تھے۔ دلی کی چوٹ ان پر پوری طرح اپنا اثر کر چکی تھی۔ وہ ایک ٹوٹے ہوئے دل اور بجھے ہوئے چراغ کی مانند تھے۔ یہ بجھتا ہوا چراغ کبھی کبھی بھڑک بھی اٹھتا تھا۔ انھیں محبّت کی ناکامیوں کا شدید احساس تھا۔ وہ زہر کے تلخ گھونٹ پینے کے باوجود مسکراتے رہتے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک اہم رُخ تھا۔ وہ اپنی ناکامیوں کو بھولنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ اور اس کوشش کی تان اکثر میکشی پر ٹوٹتی تھی۔ جوش صاحب کی صحبت نے اس میں اور اضافہ کر دیا۔ اب مجاز رند سے رند بلانوش ہو گئے تھے۔ جوش اگر گھڑی سامنے رکھ کر پیتے تھے تو مجاز گھڑا سامنے رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ سوزش غم نے

مجاز میں سیمابی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ ایک جگہ جم کر بیٹھنے کے بجائے ہر وقت گھومتے رہتے تھے۔ کوچہ نوردی ان کی عادت ہو گئی تھی۔ کوئی ہم مشرب مل گیا تو خیر ورنہ اکیلے ہی ان کا یہ شغل جاری رہتا۔ کبھی امین آباد میں ہیں تو کبھی حضرت گنج کبھی یونیورسٹی روڈ کے چکر ہیں تو کبھی فیض آباد روڈ آباد ہے اور کبھی حسین گنج اور ڈالی گنج میں چہل قدمی ہے۔

۱۹۳۹ء کا ذکر ہے جب الہ آباد یونیورسٹی کے وزیانگرم ہال میں مسلم بورڈنگ ہاؤس کا سالانہ آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا تو اس مشاعرہ میں صفی، جوش جیسے اساتذہ کے ساتھ مجاز۔ جذبی اور جان نثار اختر بھی شریک ہوئے۔ اس مشاعرہ میں مجاز نے اپنی نظم "آوارہ" سنائی جس کو بہت پسند کیا گیا اور جب وہ اس بند پر پہنچے

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

زخم خوردہ دل کی یہ آواز لوگوں کے سینے میں اترتی چلی گئی اور صفی نے بے اختیار بڑھ کر مجاز کی پیشانی چوم لی۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ جوش مستقل طور پر لکھنؤ میں رہنے لگے تھے اور ان کا رسالہ "کلیم" "نیا ادب" میں ضم ہو گیا تھا۔ مجاز۔ سبط حسن اور علی سردار کے ساتھ جوش بھی اس کے سرپرست ہو گئے تھے۔ "نیا ادب" تو عمر ترقی پسندوں کا رسالہ تھا۔ ان ترقی پسندوں کے چار خاص مشغلے تھے۔ تعلیم۔ ادب۔ سیاست اور آوارہ گردی۔ ان کی بغاوت کا انداز

رومانی اور انفرادی تھا جس کا سبب سے حسین بیگم مجاز کی دل آویز شخصیت تھی۔

مجاز کے دل کی جلن اور ان کی آشفتہ سری روز افزوں ترقی پر تھی۔ اس آگ نے ان کے تمام ہوش و حواس تک چھین لئے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں یہ آگ بھڑک کر نروس بریک ڈاؤن کی شکل میں ظاہر ہوئی یہ مجاز پر دیوانگی کا پہلا حملہ تھا۔ اس وقت ان کی بہن حمیدہ لکھنؤ ہی میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھ رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے بھائی کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ مگر مجاز کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ کبھی اخبار سنتے تھے شیلی اور کیٹس کے مجموعے سنتے۔ کبھی بے تکی اور بے تکان باتیں کرتے اور کبھی یہ خبط کہ فلاں فلاں مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور رقیب روسیاہ مجھے زہر دینے کی فکر میں ہے۔ یہ مجنونانہ کیفیت زیادہ دن تک نہ رہی اور معقول علاج سے وہ بہت جلد سنبھل گئے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کے لئے صفیہ کے ساتھ نینی تال چلے گئے۔ وہاں سے جب واپس ہوئے تو مکمل صحتیاب تھے۔ اب مجاز بہت کچھ بدل چکے تھے۔ وہ ایک شہری کی طرح پرسکون زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ اسی جستجو میں انھوں نے بمبئی انفارمیشن میں ملازمت کر لی۔ کچھ دن تو بڑی خیر و خوبی سے کام کرتے رہے مگر بہت جلد یہاں سے اکتا گئے اور پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں ایل ایل بی میں داخلہ لے کر تعلیمی سلسلہ شروع کر دیا اور "نیا ادب" کی ادارت بھی کرتے رہے۔ بقول جناب پروفیسر آل احمد سرور "یہ پرچہ ترقی پسند تحریک کا نقیب تھا۔ اس سے مجاز کا تعلق ذہنی زیادہ اور عملی کم تھا۔" اس کے بعد "پرچم" کی ادارت کی۔ اسی عرصہ میں لکھنؤ سے "ہندوستان" اخبار جاری

مجاز علی گڑھ کے دوستوں کیساتھ

بیٹھے ہوئے :-

لقمان احمد صدیقی (مرحوم) ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو
معین احسن جذبی ۔ مجاز ۔ فیض الرحمن اعظمی (مرحوم)

کھڑے ہوئے :-

جاوید کمال ۔ انجم اعظمی ۔
خلیل الرحمن اعظمی ۔ شہاب جعفری ۔

(سنہ ۱۹۵۱ء)
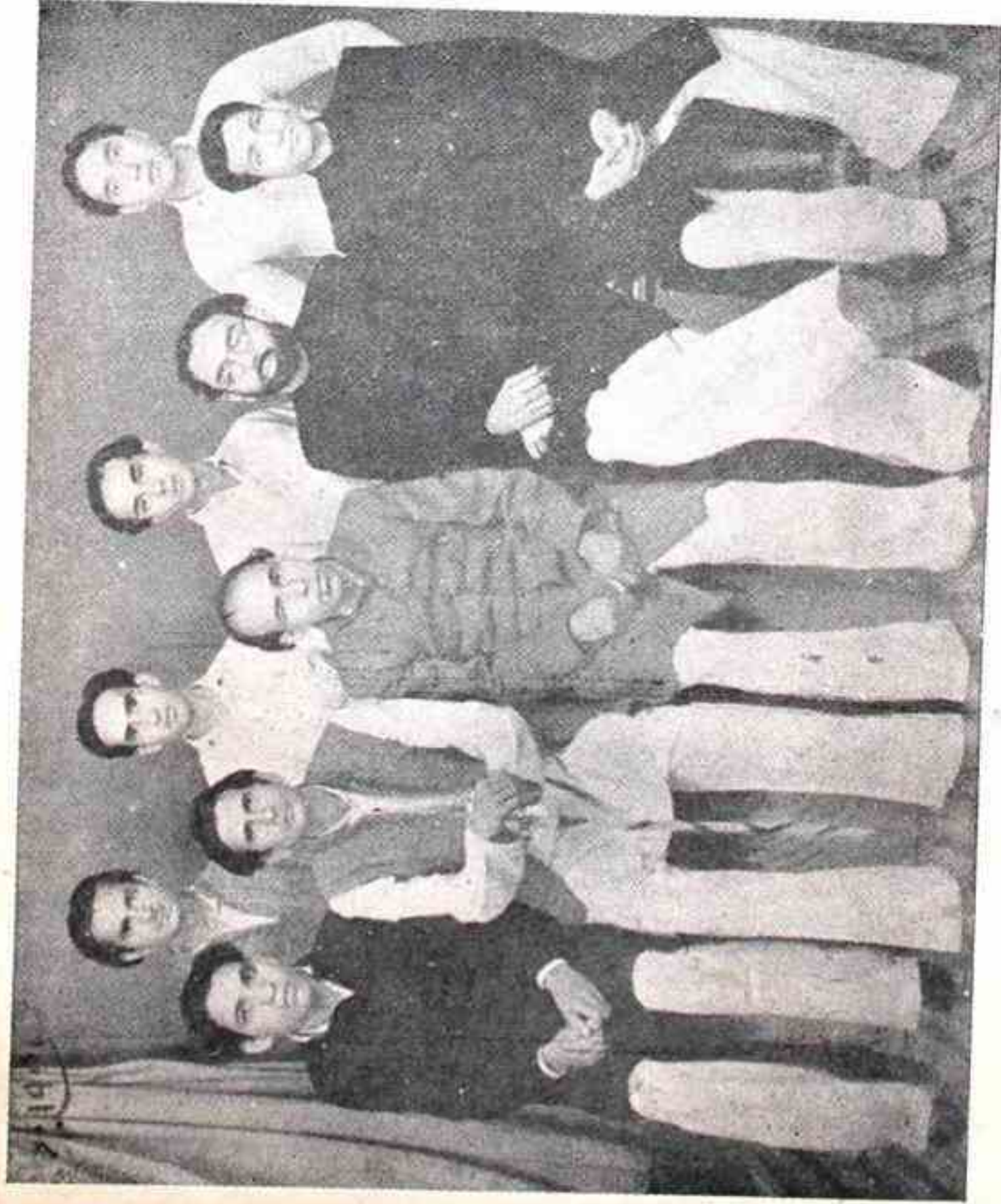
ہوا۔ اس میں مجاز کی "اندھیری رات کا مسافر" اور "سرمایہ داری" جیسی نظمیں شائع ہوئیں۔ ساقی کے سالنامہ میں "آوارہ" نکلی۔ اس وقت ترقی پسندوں میں باغیانہ جوش تھا ماضی کی شاندار سرمائے سے بغاوت اور تہذیب و اخلاق فرسودہ تصور کئے جاتے تھے۔ مجاز پر ان میلانات کا گہرا اثر ہوا تھا۔

۱۹۴۱ء میں جدید شعرا کا مشاعرہ منعقد ہوا جس کے منتظم لکھنؤ آل انڈیا اسٹیشن کے ڈائرکٹر سومناتھ چب تھے اور صدر شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے علاوہ ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر۔ پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی۔ احمد علی حیات اللہ انصاری۔ انور جمال قدوائی اور سبط حسن جیسے لوگ دلچسپی لے رہے تھے۔ شعرا میں جذبی۔ فیض۔ مخدوم جان نثار اختر اور سردار جعفری کے علاوہ مجاز بھی شریک تھے۔ مجاز کی آنکھوں کی گہری اُداسی میں شوخی کی بجلیاں بھی چمک رہی تھیں۔ جوش نے ان کی شخصیت کو ایک فقرہ میں سمیٹ لیا ہے۔ "وہ ایک نگاہ میں سارے حسن کو اور ایک گھونٹ میں دنیا کی ساری شراب کو پی جانا چاہتا ہے۔" مجاز نے اس مشاعرہ میں جو غزل پڑھی تھی اس کا آخری شعر یہ تھا۔

اس محفل کیف و مستی میں اس انجمن عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

۱۹۴۲ء تک مجاز کی سرشاری دم دیتی رہی۔ اس کے بعد یہ خمار اترنے لگا۔ زندگی کے حقائق پورے طور سے جھکنے لگے اور مجاز کے دیرینہ دوستوں کا حلقہ ٹوٹتا گیا۔ اب مجاز تنہا بیٹھ کی سلگی ہوئی آگ کو بجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ اور ہارڈنگ لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کی

ملازمت قبول کر کے دہلی چلے گئے مجاز کو مسلسل ناکامیوں نے ناکارہ اور کاہل بنا دیا تھا۔ دوسرے وہ نوکری کے شروع ہی سے خلاف تھے۔ مگر اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ وہ اپنی ملازمت کے ایام میں لوگوں سے کہا کرتے تھے۔ "آجکل ہم پابہ زنجیر ہیں"۔ ہارڈنگ لائبریری کی ملازمت، جوش صاحب کا ساتھ اور کچھ پرانے ساتھیوں کی صحبت مجاز کا رندانہ لاابالی پن پوری طرح چمک اٹھا۔ غالب نے تو چند وجوہ کی بنا پر "ایک گونہ بیخودی" کا ذکر کیا تھا مگر مجاز اسے عملی جامہ پہنا رہے تھے۔ ہر وقت ان پر بے خودی طاری رہتی تھی۔ گویا میکشی جزو زندگی بن گئی تھی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے حال و مستقبل سے انجان بن کر ایک راہ پر دوڑے چلے جا رہے تھے۔

مجاز کی والدہ اور بہنیں ان کی زندگی سنوارنے کی ہر ممکن کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔ اس عرصہ میں صفیہ کے ملاقاتیوں میں سے ایک ملاقاتی کو مجاز سے ہمدردی پیدا ہو گئی اور کچھ اس کے گھریلو حالات بھی اچھے نہیں تھے۔ صفیہ کے مشورہ نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور وہ مجاز کی شریک زندگی بننے کے لئے راضی ہو گئی۔ وہ ایک پڑھی لکھی برسر روزگار اور گھریلو قسم کی لڑکی تھی۔ صفیہ کے توسل سے مجاز کی اس سے سرسری ملاقات بھی تھی۔ مجاز کے جذبات کا اگرچہ گلا گھٹ چکا تھا اور تمنائیں پامال ہو چکی تھیں پھر بھی ایک موہوم سی امید باقی تھی جو دم دے رہی تھی اور اسی امید کا سہارا لے کر انھوں نے اس رشتہ کو منظور بھی کر لیا۔

مجاز دہلی سے بلائے گئے اور بنا سنوار کر دکھا دینے کے لئے کھیجے گئے ہر ممکن کوشش کے باوجود ان میں جاذبیت اور دلکشی پیدا نہ ہو سکی

اور یہ صورت بھی بنتے بنتے بگڑ گئی۔ اس شکست نے مجاز کی کمر توڑ دی۔
ستاروں پہ کمندیں پھینکنے والے کو خذف ریزے بھی نہ مل سکے اور مجاز
پھر دلی واپس آ گئے۔ نیا غم دور کرنے کے لئے ان کی شراب نوشی اور بڑھ گئی
وہ خود کو بہلانے کے لئے نت نئے راستے اختیار کرنے لگے۔ کبھی "ادیب"
دہلی سے منسلک ہوئے اور کبھی تحریک رائے بریلی کے رکن ادارہ ہوئے۔
مگر کہیں بھی کسی بھی صورت میں زخم خوردہ دل نہ بہل سکا۔

اب دلی کی کوچہ نوردی تھی اور مجاز تھے۔ ایک ٹوٹا ہوا ساز تھا۔
اور دم توڑتا ہوا مغنی۔ جس کی صرف ایک ہی صدا تھی "کوئی نغمے تو کیا
اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے"۔ اسی حالت میں ۱۹۴۴ء میں اچانک
ان کی ملاقات ریڈیو اسٹیشن پر عصمت چغتائی سے ہوئی۔ بقول عصمت
چغتائی "یہ وہ زمانہ تھا جب مجاز کا ستارہ شاعری ڈوب چکا تھا۔ کچھ کچھ
متقدمین کی طرف کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ وہ تو کہو اثاثہ اتنا جمع ہو چکا
تھا کہ کچھ کچھ پاؤں جمے رہے ورنہ اگر لیشت پر آہنگ نہ ہوتی تو کبھی
کے ختم تھے"۔

دہلی میں ڈاکٹر انصاری کا گھر قومی رہنماؤں کا مہمان خانہ تھا۔ گاندھی جی
پنڈت نہرو سروجنی نائڈو سب دریا گنج میں انہیں کے یہاں قیام کرتے
تھے۔ مجاز بھی اس گھر کے دوست اور محبوب شاعر تھے۔ سروجنی نائڈو خاص
طور پر مہربان تھیں۔ مجاز کے چکر دریا گنج سے ریڈیو اسٹیشن تک مسلسل تھے۔
ریڈیو اسٹیشن پر حفیظ جالندھری سے ان کی چوٹیں بھی ہوتی تھیں۔ وہ
حفیظ کی نظم کے جواب میں نظم بھی کہتے تھے مگر مجاز کی وحشت میں کوئی
کمی نہ تھی۔ ان کی کس مپرسی کا عالم بدستور تھا۔

۱۹۴۵ء میں بقول صہبا لکھنوی مجاز پھر بمبئی پہنچے اور فلمی دنیا میں قسمت آزمائی شروع کی۔ یہاں انھوں نے فلم "شکایت" اور "بینا" کے چند گانے لکھے۔ فلم "غلامی" میں نظم "آوارہ" کے چند بند دیے۔ فلم "دل نادان" میں "آوارہ" کے کچھ اور چند بند نئے انداز سے پیش کئے۔ مگر یہاں بھی ان کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی اور دل برداشتہ بمبئی سے واپس ہوئے۔ ان کی حالت پھر غیر ہونے لگی اور ۱۹۴۵ء کے اختتام سے پہلے ان پر پھر نروس بریک ڈاؤن کا دوسرا حملہ ہوا۔

اس حملہ نے مجاز کے ذہن پر یہ اثر کیا کہ وہ خود اپنی عظمت کے گیت گاتے تھے۔ شاعروں کی فہرست تیار کرتے تھے۔ غالب اور اقبال کے بعد اپنا نام لکھ کر شجرہ ختم کر دیتے تھے۔ آخر کار ڈاکٹروں کی کوشش تیمارداروں کی دلجوئی اور عزیزوں کی دعاؤں نے ردِّ بلا کا کام کیا۔ آئی ہوئی موت ٹل گئی اور نیم مردہ جسم میں پھر جان آگئی۔ مگر اب مجاز کا عدم وجود برابر تھا۔ زندگی صرف برائے نام زندگی تھی۔

بیکاری اور تنہائی سے مجبور ہو کر انھوں نے پھر اپنے دیرینہ آخری سہارے شراب کا سہارا لیا۔ اور اس شدت سے لیا کہ خود کو شراب میں کھو دینے کی کوشش کی۔ اب مجاز کے پینے کی کوئی حد نہ تھی۔ جب تک ہوش رہتا پیتے رہتے۔ مجاز کی اس بادہ پرستی پر جگر مرادآبادی نے ایک دفعہ شراب ترک کرنے کا اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ مجاز نے ہنس کر جواب دیا۔ "آپ نے صرف ایک بار شراب چھوڑی ہے۔ میں کئی بار چھوڑ چکا ہوں" لیکن جب جوش ملیح آبادی نے ایک نظم میں ان کی شراب نوشی پر نصیحت کی تو مجاز اس کو برداشت نہ کر سکے۔ جوش نے اسی زمانے میں شیخ عبداللہ

کی تعریف میں بھی ایک نظم کہی تھی۔ مجاز نے ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر جوش پر چوٹ کی ہے۔ ایک قطعہ

نطق رسوا ذہن دریدہ ہے
یہ شنیدہ نہیں ہے دیدہ ہے
رند برباد کو نصیحت ہے
شیخ کی شان میں قصیدہ ہے

مجاز نے اس کے ساتھ ایک اور قطعہ بھی کہا تھا جس میں جوش کی سرکاری ملازمت اور انقلابی شاعری کی طرف اشارہ ہے۔

پیر جوش شباب کیا جانے
شورش اضطراب کیا جانے
سینہ انقلاب چھلنی ہے
شاعر انقلاب کیا جانے

جوش کے پندنامے کا جواب بھی مجاز نے مذکورہ بالا قطعہ کے چوتھے مصرعے پر تازہ مصرع لگا کر دیا تھا۔

دلِ شاعر پہ جو گزرتی ہے
شاعر انقلاب کیا جانے

مجاز جان بوجھ کر شراب پیتے تھے ان کو احساس تھا کہ وہ زیادتی سے شراب پیتے ہیں مگر وہ مجبور تھے۔ وہ شراب کو اپنی پناہ تصور کرتے تھے۔ اور اپنے آپ کو ایک عارضی سکون دینے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اکثر مدہوشی میں اپنی حقیقت اور اصلیت کے چہرے سے نقاب بھی اٹھا دیتے تھے۔ جان سن نے کہا ہے کہ "آدمی کی پرکھ اس کے دوستوں میں ہوسکتی ہے

یا اس وقت جب وہ شراب پیئے ہو۔" جانسن کا یہ قول مجاز پر بڑی حد تک صادق آتا ہے۔ ابوالخیر کشفی کا بیان ہے کہ "وہ ایک شام جب ہم ایک بہت گھٹیا قسم کے دیسی شراب خانے میں بیٹھے تھے اور مجاز دیسی شراب (ٹھرے) سے اپنے کلیجے کو جلا رہا تھا۔ وہ ایک دم چیخ پڑا۔

"سنتے ہو میری شراب نوشی میرا احساس شکست ہے۔ اعتراف شکست ہے۔ میں نے شراب میں پناہ ڈھونڈھی ہے۔ تم مجھ سے اونچے ہو وہ سب مجھ سے اونچے ہیں جنھیں غم روزگار شراب نہ پلا سکا۔ وہ لڑتا جاتے ہیں وہ عارضی بیگانگی کا سہارا نہیں لیتے۔ تم شراب ہرگز نہیں پینا میں شراب تسکین کے لئے پیتا ہوں اور اگر تمھیں نماز پڑھنے سے تسکین ہوتی ہے تو نماز پڑھو۔ وہ بھی تو بیخودی ہے۔ ہم دونوں کا مقصد ایک ہے۔ راستے الگ الگ ہیں ہم دونوں Great (بڑے) ہیں سارے شرابی Great ہیں اور سارے نمازی بھی" اس سے ظاہر ہے کہ وہ شراب کے سود و زیاں سے واقف تھے۔ نماز کی عظمت کو پہچانتے تھے۔ غم روزگار نے انھیں شراب کی طرف جھکا دیا تھا۔

حقیقت کی نظر سے اگر دیکھا جائے تو مجاز کی بربادی میں سماج کا بہت گہرا ہاتھ تھا انھوں نے دنیا اور اہل دنیا کو ہر انداز سے دیکھا تھا اور ہر طور سے سمجھا تھا۔ انھوں نے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے ظ انصاری لکھتے ہیں کہ

۱۹۴۶ء میں بمبئی کے فرقہ وارانہ فساد کا جان سوز منظر مجاز نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ علی سردار جعفری۔ مجروح سلطان پوری ساحر لدھیانوی اور حمید اختر بھی تھے۔ مجروح کسی طرح اپنا دامن بچا کر

مجاز

نکل گئے اور یہ لوگ سب اپنے ہیڈ کوارٹر میں پناہ گزین ہو گئے۔ جو سینڈہرسٹ روڈ پر واقع تھا۔ یہاں مجاز کو کشت و خون کے دل ہلا دینے والے مناظر دیکھنے پڑے اور اس تماشے نے ان کی قوت گویائی بھی سلب کر لی۔ انھوں نے ایک آدمی کو قتل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا تو تین دن تک کھانا نہیں کھا سکے۔ ان پر اس حادثہ کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ کچھ دن کے لئے مبہوت سے ہو گئے۔ ان کے ہر ساتھی نے کچھ نہ کچھ اس فساد پر روشنی ڈالی تھی۔ مگر وہ اس واقعہ کے متعلق کچھ نہ کہہ سکے۔" آگے چل کر ظ انصاری نے اس طرح لکھا ہے کہ "سال گزر گیا اور مجاز کچھ دن لکھنؤ رہ کر پھر بمبئی واپس آگئے۔ اب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح نمودار ہوئی۔ یہ کمیونسٹ پارٹی میں پی۔ سی۔ جوشی کا دور تھا۔ ابھی پارٹی کے جسم پر کانگریس وزارتوں کے ظلم و تشدد کے زخم ہرے تھے کہ ایک دم ہمیں کانگریس کے ترنگے جھنڈوں سے اپنی خانقاہ سجانی پڑی۔ اور وہی جھنڈے لے کر جلوس کی شکل میں نکلنا پڑا۔ رات کو شہر کی ساری آبادی سڑکوں پر نکل آئی۔ گلی گلی ٹولیاں گھوم رہی تھیں۔ نعرے لگاتی ہوئی شور مچاتی ہوئی۔ دیکھا تو ایسی ایک ٹولی میں مجاز بھی رقص فرما تھے۔ سرشار اور از خود رفتہ۔ سڑک پر ننگے پاؤں ننگے سر کود رہے تھے۔ اور پوری ٹولی ان کے گیت پر تالیاں بجا رہی تھی۔ اور نعرے لگا رہی تھی۔

بول اری او دھرتی بول

راج سنگھاسن ڈانواں ڈول

ہم سب ساتھی بھی اس ٹولی میں ڈوب گئے۔ ڈیڑھ پسلی کا آدمی مجاز

صبح چار بجے تک اس طرح تمام رات کھلی سڑکوں پر دھوم مچاتا گھوما کیا۔"
مجاز کے اس گیت کی ابتدا ریڈیو کی مشہور گانے والی گوہر سلطان کے گھر پر سبط حسن اور فرحت کے باہمی جھگڑے میں ہوئی تھی۔

وطن کی آزادی کے خواب دیکھنے والے نے اپنے خوابوں کی تعبیر تو پالی تھی۔ مگر خود اس کی زندگی خزاں رسیدہ تھی۔ مجاز کی والدہ نے اس ڈوبتے ستارے کی روشنی کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے ایک قریبی عزیز کی لڑکی کو مجاز کی شریک حیات بنانے کی کوشش کی۔ لیکن مجاز جس کی آنکھوں نے عورت کا ہر روپ دیکھا تھا۔ اس کی نظر کو یہ سہارا نہ جچ سکا اور کوشش کے باوجود ان کے ساز کے بکھرے ہوئے تار یکجا نہ ہو سکے۔ ابوالخیر کشفی کے قول کے مطابق " ان کے شب و روز محدود ہو گئے تھے اور شراب کے سوا کوئی مشغلہ باقی نہ تھا۔"

جنوری ۱۹۵۱ء میں مجاز پہلی اور آخری بار کراچی کے ایک مشاعرہ میں شرکت کرنے کے لئے پاکستان گئے۔ وہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا ملی ترانہ بھی لکھ چکے تھے۔ جو ان کے مجموعہ کلام کے تیسرے ایڈیشن "شب تاب" میں شامل ہے۔ پاکستان میں ان کی پرانے ساتھیوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ جن میں نصیر حیدر قابل ذکر ہیں۔ ان سے گفتگو کے دوران جب تقسیم اور پاکستان کا ذکر آیا تو بقول نصیر حیدر "مجاز نے ایک مضمحل سی آہ بھری اور یہ مصرع پڑھا" ع

"دل سی شے دین پر فدا کر دی"

ان کی تحریر کے بموجب مجاز نے یہ تازہ ترین مصرع پاکستان میں ہی کہا تھا۔ مجاز پاکستان میں بھی پرانے دوستوں کے حلقہ کے باوجود اپنی

مجاز

اداسی کو نہ بھول سکے اور کچھ عرصہ رہ کر لکھنؤ واپس آگئے۔

مجاز نے ۷؍ نومبر ۱۹۵۱ء میں کانپور کے ترقی پسند مصنفین کے مشاعرہ میں شرکت کی لیکن بہت بجھے بجھے سے تھے۔ اور چہرہ مرجھایا ہوا تھا حرکات و سکنات اور بات چیت میں شگفتگی نہیں تھی جو ان کے مزاج کی ایک عام خصوصیت تھی۔

۱۹۵۲ء میں مجاز سیف الدین کچلو کے ساتھ کل ہند تہذیبی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس وقت ان کی دیوانگی کے آثار پھر ظاہر ہونے لگے تھے۔ یہ ان پر دیوانگی کا تیسرا اور آخری دورہ تھا۔ یہ آخری حملہ ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے شدید حملہ تھا۔ اس وقت مجاز دہلی آچکے تھے۔ نہ گھر کا خیال تھا۔ نہ بازار کا ہوش۔ وہ اپنی عزت ماں باپ کی عظمت اور خاندانی وقار سے بے نیاز دلی کے کوچوں کی خاک اڑا رہے تھے اور تماشہ بنے ہوئے تھے۔ اکثر یہاں سے ان کے مرجانے کی جھوٹی خبریں ان کی والدہ تک لکھنؤ پہنچ رہی تھیں۔ کبھی موٹر سے کچل جانے کی جھوٹی خبر۔ کبھی سڑک پر ٹھٹھرا ہوا پائے جانے کی خبر۔ غرض مجاز کی دیوانگی حد سے تجاوز کر گئی تھی۔ وہ خود سے بالکل بے گانے ہو گئے تھے۔

ان کی عمر رسیدہ والدہ جنھوں نے اپنے بیٹے کو آسودہ اور خوشحال دیکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جنھوں نے اس کے مستقبل کو شاندار اور خوشگوار بنانے کی امکانی حد تک مواقع فراہم کئے اب وہی ان کی والدہ تھیں جو ان کے دیوانہ پن کے حالات سن سن کر مایوس اور نامرادی کے عالم میں گھبرا کر بقول حمیدہ سالم "جانماز پر بیٹھ بیٹھ کر دعائیں مانگتی تھیں یاالٰہی اسے اٹھالے یا مجھے۔ جو میں اس طرح کے تماشے نہ دیکھوں۔"

مجاز کی اس دیوانگی کے عالم کو دیکھ کر جوش ملیح آبادی جو مجاز کے بہت قریب آ چکے تھے ان کے ہم مشرب اور ناصح بھی تھے انھوں نے مجاز کی موت پر یہ بھی لکھا ہے کہ "مجاز میں نے تیرے والدین کو پرسا نہیں دیا ہے۔ اس لئے کہ انھیں چاہیے تھا کہ وہ تیرا پرسا مجھے دیتے۔ تو ان کا صرف بیٹا تھا لیکن تو میرا کیا تھا۔ یہ ان بد نصیبوں کو معلوم نہیں۔" یہ وہی جوش ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے حمیدہ ابو سالم نے لکھا ہے کہ "دلی سے جوش صاحب کا خط آیا کہ مجاز کو آگرہ بھیج دیا جائے۔" جوش صاحب کے ان الفاظ سے مجاز کے عزیزوں کو جسقدر بھی صدمہ پہنچا ہو وہ کم ہے۔ جوش جن کو الفاظ پر قدرت حاصل ہے اپنے اس خیال کو کسی اور پیرائے میں بھی لکھ سکتے تھے۔ حمیدہ ابو سالم لکھتی ہیں کہ "جوش صاحب کو میں نے خط لکھا کہ اپنے رسوخ استعمال کر کے رانچی میں جگہ دلوا دیں۔ جوش صاحب کو خط ملا یا نہیں۔ بہر حال میں جواب کے انتظار میں ہی رہی۔" حمیدہ ابو سالم آخر مجاز کی بہن تھیں۔ انھوں نے بھائی کی بگڑی ہوئی حالت پر قابو پانے کے لئے خود ڈاکٹر ڈیوس جو رانچی ہوسٹل کے انچارج تھے۔ ان سے براہ راست خط و کتابت کی اور مجاز کی زندگی کے حالات ان کو لکھ کر بھیجے بہن کی دل پذیر تحریر اور مجاز کے حالات زندگی سے متاثر ہو کر ڈاکٹر صاحب نے بی کلاس وارڈ میں ایک بیڈ دینے کی اجازت دیدی اور مجاز کو رانچی بھیج دیا گیا۔ مجاز کے ضعیف العمر باپ نے بیٹے کو بچانے کے لئے اپنی عمر کی آخری کمائی بھی لگا دی۔ آخر کار مجاز کی قسمت نے پھر یاری کی۔ زندگی نے پھر وفا کی اور وہ چھ مہینے کے بعد رانچی سے صحتیاب ہو کر واپس آگئے۔

مجاز کے رانچی کے قیام کے جو کاغذات دستیاب ہوئے ہیں اور جو پاگل خانہ کی یادگاریں ہیں۔ ان میں کچھ نامکمل چیزیں بھی ملی ہیں۔ مثلاً ان میں ایک مصرع یہ بھی تھا۔ ع

فراق ہوں اور نہ جوش ہوں میں: مجاز ہوں سرفروش ہوں میں

اس مصرع سے فراق اور جوش پر جو روشنی پڑتی ہے وہ ظاہر ہے۔ کاغذات میں جا بجا ماضی کی یادیں بکھری ہوئی ہیں" کیا قیامت ہے کہ ایک دوست رقیب آج بھی ہے"۔ بہت سے ناموزوں مہمل اور بے معنی مصرعے بھی ہیں جو اس بات کی کھلی ہوئی شہادت دیتے ہیں کہ ۱۹۵۲ء تک مجاز کے دل و دماغ کے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ اور فکر کی قوت دم توڑ چکی تھی۔ جس کے مصرعوں میں کبھی جھول بھی نہیں پڑتا تھا اور جو الفاظ کے پیروں میں گھنگرو باندھنے پر قادر تھا۔ اس نے بے ربط بے معنی اور بے جوڑ مصرعے بھی اپنے دیوانہ پن میں کہے ہیں۔ گویا یہ اس کا ثبوت ہے کہ مجاز رانچی کے پاگل خانہ میں مکمل مصرعے کہنے پر بھی قادر نہیں رہے تھے۔

مجاز جب رانچی سے صحتیاب ہو کر واپس آئے تو ایک ماہ گزرنے کے بعد ان کو اپنی بہن صفیہ کی موت کے حادثہ سے سابقہ پڑا۔ جس نے زندگی بھر مسلسل چوٹیں کھائی ہوں اسے پھر ایک جانکاہ حادثہ کا سامنا ہو۔ ایسے عالم میں جو کچھ بھی اس پر گذر جائے وہ کم ہے۔ مگر مجاز نے اس موقع پر سنجیدگی کا ثبوت دیا اور صبر و تحمل سے کام لیا۔ انھوں نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور مرحومہ بہن صفیہ کے بچوں میں دلچسپی لینی شروع کی

شراب سے قطع تعلق سا کر لیا۔ اور زیادہ تر وقت گھر پر گزرنے لگا۔ بھانجوں کی تعلیم و تربیت ان کی دیکھ بھال اور ان کے تفریحی مشاغل ہر ایک میں اب مجاز کا دخل تھا۔ گویا اب وہ بیس پچیس سال کے مجاز نظر آتے تھے۔ لیکن ان کا یہ طرز عمل چھ مہینہ کی قلیل مدت سے آگے نہ بڑھ سکا۔

مجاز کی زندگی نت نئے شعبدے دکھا رہی تھی۔ وہ پھر اپنے پرانے ہم مشرب دوستوں کے حلقہ میں گھر گئے جو ان کی فقرہ بازی اور لطیفہ سنجی سے لطف اٹھاتے تھے۔ اور ان کی باغ و بہار طبیعت سے محظوظ ہوتے تھے۔ اس حلقہ نے مجاز کو پھر محفل ساغر و مینا کی دعوت دی۔ توبہ کا قفل کیا ہوا بادہ نوش دریا نوش ہو گیا۔ مجاز کی پرانی سرمستی پھر عود کر آئی اور پھر وہی بیہوشی کا عالم طاری ہونے لگا۔ لیکن اس سرمستی میں بھی حلقہ شعر و ادب کی نگاہیں مجاز پر پڑتی رہیں اور وہ مشاعروں میں برابر شریک ہوتے رہے۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۲ء میں مجاز نے علی گڑھ کے کل ہند صنعتی و زراعتی نمائش کے مشاعرہ میں شرکت کی۔ اس مشاعرے میں جو شعراء شریک تھے ان میں شہنشاہِ تغزل مرحوم جگر مراد آبادی اور نشور واحدی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس مشاعرہ میں راقم کو پہلی بار مجاز کو بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا کتھئی رنگ کی دھاری دار شیروانی جس کے پورے بٹن لگے ہوئے تھے کاندھوں پر کشمشی گرم چادر سر پر بڑے بڑے بے ترتیب خشک بال، کیف آلود سرخ آنکھیں۔ اس انداز سے اسٹیج پر دوسری صف میں مجاز

جھکے ہوئے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ دوران مشاعرہ میں اناؤنسر کے ہونٹوں پر جب مجازؔ کا نام آیا تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا اور طالبات میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ ہر شخص کی بیتابانہ نگاہیں اسٹیج کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ مجازؔ جھومتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر جگرؔ (۱) اور دلؔ (۲) کے درمیان آکر بیٹھے اور انھوں نے ۱۹۵۰ء کی کہی ہوئی غزل جس کا مطلع یہ تھا

جگر اور دل کو بچانا بھی ہے
نظر آپ ہی سے ملانا بھی ہے

اپنی باریک مستانہ وار پرسوز آواز میں پڑھنا شروع کی مطلع میں جگرؔ اور دلؔ کے الفاظ پھر دونوں کے درمیان میں مجازؔ۔ مجازؔ کے شعر میں چار چاند لگ گئے تھے۔ ہر گوشہ سے بے ساختہ داد مل رہی تھی۔ ابھی نصف غزل پر ہی پہنچے تھے کہ سامعین میں سے ایک خاتون کی گود میں شیر خوار بچہ زور سے چلانے لگا۔ مجازؔ نے غزل کے شعر کو ادھورا چھوڑتے ہوئے غالبؔ کا یہ مصرع پڑھا۔

"نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا"۔

مجازؔ کا یہ مصرع پڑھنا ایک قیامت ہو گیا ان کے اس لطیفہ کا اہل محفل کی شوخ طبیعت نے بھرپور ساتھ دیا اور خاتون کی شرمندگی کی انتہا نہ رہی۔ مجازؔ کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی وہ ہمیشہ سے فقرہ تراشی اور حاضر جوابی میں طاق تھے۔ جب مجازؔ نے غزل کا آخری شعر پڑھا تو ہر طرف سے "آوارہ" "آوارہ" کی صدائیں اٹھنے لگیں۔ مجازؔ ابھی سنبھلے بھی نہ تھے کہ

سامعین کے اصرار سے مجبوراً اپنی نظم "آوارہ" شروع کرنی پڑی۔ مگر اب اس نظم کا پڑھنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ شراب نے ان کے سب کس بل نکال دیئے تھے۔ دو بندوں کے بعد ان کی سانس میں بے ربطی پیدا ہو گئی اور وہ یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھ گئے "اب مجھ سے پڑھا نہیں جاتا۔"

گمان غالب ہے کہ علی گڑھ کے مشاعروں میں مجاز کی یہ آخری شرکت تھی۔ مشاعرے کے دوسرے دن مجاز نے اس نمائش کا طواف کیا جس کی دلکشی اور رعنائیوں سے متاثر ہو کر انھوں نے ۱۹۳۱ء میں اپنی نظم "نمائش" لکھی تھی اور اس کے بعد پھر وہ علی گڑھ میں نہیں دیکھے گئے۔ بقول آل احمد سرور "ریاض نے تو رسمی طور پر خمریات کا یہ شعر کہا تھا ؎

اچھی پی لی خراب پی لی
جیسی پائی شراب پی لی

مگر مجاز نے اس پر برابر عمل کیا۔" ان کے اس مسلسل عمل نے انھیں زندہ درگور کر دیا تھا۔ شعر کی دیوی کا سایہ ان کے سر سے اُٹھ گیا تھا اور خاموشی کا یہ عالم تھا کہ جیسے ہونٹوں پر مہر لگ گئی ہو۔ مگر یہ شراب کا دھنی جب شغل شراب میں مشغول ہوتا تو اس کے ہونٹوں کو خود بخود جنبش ہونے لگتی تھی۔ جگر کے اشعار سے میکشی کا آغاز ہوتا اور سرور بڑھنے پر جوش کے اشعار پڑھے جاتے تھے اور آخر میں اقبال کے۔ گویا اقبال ان کا حرف آخر تھے۔ ۳ دسمبر ۱۹۵۵ء کو لکھنؤ یونیورسٹی میں طالب علموں کی ادبی

کانفرنس تھی۔ جس میں مشاعرہ کا بھی پروگرام تھا۔ اور شریک ہونے والے شعراء میں مجاز بھی تھے۔ اس دن شام کو حضرت گنج میں مجاز کی ملاقات ساحر لدھیانوی اور سردار جعفری سے ہوئی اگرچہ مجاز کافی پیئے ہوئے تھے۔ مگر دونوں دوستوں سے بڑے تپاک سے ملے اور اپنا یہ شعر پڑھا۔

ہمدم یہی ہے رہگذر یار خوش خرام
گذرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

بقول سردار جعفری "طالب علموں کی ادبی کانفرنس کے مشاعرہ میں مجاز نے بڑی سنجیدگی کا ثبوت دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کا پرانا مجاز زندہ ہوگیا ہے۔" مجاز نے جعفری سے یہ کہتے ہوئے کہ "نہ جانے کب ملاقات ہو" یکے بعد دیگرے اپنی کئی چیزیں لہک لہک کر سنائیں۔ مجمع حیران بھی تھا اور خوش بھی تھا۔ مجاز نے آخری چیز جو مشاعرہ میں سنائی وہ ان کی ۱۹۵۰ء کی کہی ہوئی غزل تھی جس کے حسب ذیل دو شعر انھوں نے بار بار پڑھے تھے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
یہ اک سیل غم و سیل حوادث
سراسر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

۴ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو مجاز سردار جعفری اور ساحر کے ساتھ ہوٹل میں رہے اور ان کے رات کو پینے کے لئے ایک وسکی کی بوتل

بھی منگوائی گئی۔ تیسرے پہر کو جبکہ مجاز سوئے ہوئے تھے۔ سردار جعفری اور ساحر ایک چائے کی دعوت میں چلے گئے۔ ان کی واپسی پر مجاز ہوٹل سے غائب تھے۔ بقول سلامت علی مہدی "مجاز انہیں اور نسیم انہونوی کو ۴ر دسمبر کی رات میں ساڑھے ۹ بجے امین آباد کے دیسی شراب خانے کے قریب اپنے ایک دوست کے ہمراہ انتہائی نشے کی کیفیت میں ملے تھے"۔ اس کے بعد تقریباً ۱۲ بجے وہ اپنے ہم مشربوں کے ساتھ لال باغ کے ایک دیسی شراب خانے پہونچ گئے۔ وہاں جاکر انھوں نے جی کھول کر پی اور اتنی پی کہ دنیا و مافیہا کا ہوش نہیں رہا۔ ان کے باوفا ساتھی ۳ بجے رات کو انہیں شراب خانے کی سرد کھلی فضا میں بے ہوش اور تنہا چھوڑ کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔

۵ر دسمبر کی صبح کو شراب خانے کے مالک نے مجاز کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر انہیں بلرام پور ہسپتال میں پہونچا دیا۔ ڈاکٹر نے ڈبل نمونیہ تجویز کیا اور پینسلین کے انجکشن دینا شروع کر دئے شام کو ہسپتال کے انچارج کی تشخیص سے ظاہر ہوا کہ جسم پر فالج کا اثر ہو گیا ہے اور دماغ کی رگیں پھٹ گئی ہیں۔

مجاز کی اس حالت کی خبر ان کے گھر پہونچی۔ اور ان کے عزیزوں کے علاوہ سردار جعفری اور ساحر بھی اس وقت ہسپتال پہونچے جبکہ یہ جان شکستہ موت کے گہرے سائے میں اپنی زندگی کے آخری لمحات طے کر رہی تھی۔ ڈاکٹر مایوسی کا اظہار کر چکے تھے صرف آکسیجن کے ذریعہ سانسوں کا ایک بے ربط

سلسلہ قائم تھا۔ اور یہ سلسلہ دس بجے رات تک جاری رہا۔ زندگی اور موت میں کشمکش ہوتی رہی۔ لیکن موت پھر موت تھی اس کے بھیانک اور گھرے سلئے زندگی پر جم کر رہے اور ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کو دس بجکر ۲۵ منٹ پر اردو شعر و ادب کا کیٹس نوجوانوں کا محبوب شاعر اور ادیبوں کا زندہ دل دوست ہمیشہ کے لئے ان سے رخصت ہوگیا۔ بقول سردار جعفری "مجاز کے سرہانے ان کی شیدائی ایک طالب علم لڑکی بیٹھی تھی جو ان کی محبوبہ کی ہم نام تھی"۔

مجاز لکھنؤ میں نشاط گنج کے نئے قبرستان میں صفیہ اختر کی قبر کے برابر دفن کئے گئے۔ مجاز کی قبر کے برابر ان کی والدہ کی قبر ہے جن کا انتقال ۸ جنوری ۱۹۵۷ء کو ہوا۔ مجاز کی قبر کا تعویذ سنگ مرمر کا ہے جس پر ان کا یہ شعر کندہ ہے۔

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبح نو مجاز
ہم پر ہے ختم شام غریبان لکھنؤ

۱۹۵۵ء ہمارے شعر و ادب میں بڑی بدقسمتی کا سال ہے۔ اس سال کے اندر اردو شعر و ادب کی ایسی عظیم شخصیتیں اس دنیا سے اٹھ گیئں جنھوں نے اردو شعر و ادب کی تہذیب و تحسین میں ناقابل فراموش حصہ لیا۔ اس دور نے ختم ہوتے ہوتے چراغ حسن حسرت، منٹو، خواجہ حسن نظامی، بیخود دہلوی اور علامہ کیفی کے بعد اردو ادب کے کیٹس اسرار الحق مجاز کو بھی ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔

۴۴ سالہ مجاز کی بے وقت موت پر ہندو پاک کے ہر ادب
نواز حلقہ نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
نے اپنے طالب علم شاعر کو سب سے بڑا خراج عقیدت اس طرح پیش
کیا کہ مرحوم کی ایک نظم کو یونیورسٹی کا ترانہ تسلیم کر لیا اور
مجاز کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا۔

مجازؔ

شاعری

مجاز کی شاعری کا آغاز آگرہ کے تعلیمی ماحول میں ۱۹۲۹ء میں ہوا عام روش کے مطابق اول اول ان کا رجحان بھی غزل ہی کی طرف تھا۔ ان کی پہلی غزل اور پہلے تخلص کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں جیسا کہ پہلے باب میں بتایا جا چکا ہے۔

شاعری ایک فطری ملکہ ہے جس کو شاعر لے کر پیدا ہوتا ہے اور جو شاعر کی زندگی کے ساتھ ساتھ تربیت پاکر بالغ ہوتا ہے۔ مجاز بھی اس ملکہ کو لے کر پیدا ہوتے تھے۔ پھر جب انھوں نے آنکھ کھولی تو گھر میں بھی شعر و شاعری کا چرچا دیکھا۔ مجاز کے چچا نواب حسن فوق جن کو دیوانہ کہا جاتا ہے ایک اچھے شاعر بھی تھے ان کے چند شعر حسب ذیل ہیں۔

برس رہا ہے جو برسے سحاب کیا ہوگا
ہمارے دیدۂ تر کا جواب کیا ہوگا
یہی نہ ہوگا کہ در در کی خاک چھانیں گے
بس اور اے دل خانہ خراب کیا ہوگا
جو عہدہ دار جنوں ہیں انھیں خطاب ملے
میں بادشاہ ہوں میرا خطاب کیا ہوگا

(نواب حسن فوقؔ)

گھر کے شاعرانہ ماحول نے مجاز کے فطری ملکہ کو اور بھی فروغ دیا لیکن یہ ملکہ صحیح معنوں میں اس وقت ابھرا جبکہ تعلیمی سلسلہ میں ان کا آگرہ رہنا ہوا۔ آگرہ میں ان کو کچھ ایسے بزرگوں کی صحبت ملی جو اُردو شاعری میں استادانہ شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اور ان کا ساتھ ایسے رفیقوں کا ہوا جو ان کی طرح شعر و ادب کا ذوق اور شعر کہنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

مجاز کی شاعری کا یہ ابتدائی دور سیاسی و سماجی حالات کے سبب سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس وقت ملک کی سیاسی اور معاشی زندگی میں انقلاب کے آثار رونما ہو رہے تھے۔ جو شعر و ادب کو بھی متاثر کر رہے تھے۔ پرانی روایتیں دم توڑ رہی تھیں۔ اور نئے اثرات قبول کئے جا رہے تھے۔ سیاست میں قومی بیداری اور معاشی کشمکش کی نئی منزلیں رونما ہو رہی تھیں۔ سرمایہ داری کے نظام سے بغاوت کا میلان عام ہو رہا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی آسودگی کے مسئلے در پیش تھے۔ زندگی کی ہر سمت میں ایک ہیجان پیدا تھا۔ یہ بحرانی اثرات ہر طبقہ اور ہر حلقہ پر یکساں پڑ رہے تھے۔

اردو ادب کی دنیا بھی ان اثرات سے بیگانہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے وسط سے ہی اہل شعر و ادب وقت کی نبض پہچاننے لگے تھے۔ اور تقاضائے وقت کے مطابق ادب و شعر کو زندگی کے مقاصد اور اس کے مفاد سے ہم آہنگ بنانے کی تحریک کر رہے تھے۔

غرضکہ ادب میں زندگی کے نئے مطالبات جگہ پانے لگے تھے۔

اور طرز فکر اور طرز اظہار دونوں میں ان کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ جس وقت مجاز نے شاعری شروع کی اس وقت فضا میں حالی اور آزاد کا چھیڑا ہوا راگ اپنا بھرپور اثر جما چکا تھا۔ اور ایک طرف سرور جہان آبادی۔ چکبست۔ اقبال۔ حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی نظم نگاری کی دھوم تھی تو دوسری طرف غزل میں حسرت عزیز صفی ثاقب فانی اصغر اور جگر کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ یہ سب نئی شاعری کی نسل کے لئے نئے موثرات تھے۔ اس فضا میں مجاز کی شاعری نے جنم لیا اور پرورش پائی۔

اس فضا کا مجاز پر کیا اثر ہوا انھوں نے کیا نتائج اخذ کئے اور کیوں کر اپنی راہ استوار کی یہ سب سوال ایسے ہیں جن پر ان کا ابتدائی کلام کافی حد تک روشنی ڈالتا ہے۔ مجاز کی ابتدائی شاعری کے نمونے چند اشعار ہیں جن سے ان کے شعور شعری کی اٹھان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور ان ہی چند اشعار سے یہ اشارہ بھی مل جاتا ہے کہ مجاز فطرتاً غنائی شاعر تھے۔ فانی جیسا مسلم الثبوت شاعر بھی ان کو اصلاح دیتے وقت ان کی خداداد صلاحیت پر حیرت اور استعجاب کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا ثبوت فانی کے اس جملہ سے ملتا ہے جو انھوں نے مجاز کو پہلی بار اصلاح دیتے ہوئے میکش اکبرآبادی کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ "میاں میکش اس لڑکے نے یہ غزل کہی ہے"۔ فانی کا یہ جملہ مجاز کی ذہانت اور فکر شعر کی قابلیت کی بڑی حد تک تصدیق کرتا ہے۔ فانی کی ہمت افزائی نے مجاز کے شوق کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ مجاز نے دوسری غزل کہہ کر فانی کو پھر اصلاح کے لیے بھیجی۔

ڈاکٹر محمد حسن کے بیان کے مطابق جو انھوں نے اپنی ڈائری "گل نغمہ" میں تحریر کیا ہے کہ فانی نے مجاز کی غزل پر ایک مصرع کی اصلاح کی اور ایک شعر پر دو بار صاد بنا دیا۔ اصلاح یہ تھی۔

مجاز کا شعر

قتل کر کے وہ مستیاں ان کی
خون دل بھی شراب ہونا تھا

فانی کی اصلاح

ہجر میں کیفِ اضطراب نہ پوچھ
خون دل بھی شراب ہونا تھا

مجاز نے اگرچہ بحر کا پورا پورا خیال رکھا تھا لیکن ان کی نظر شعر کے دونوں مصرعوں کے باہمی ربط تک نہیں جا سکی جو غزل کی جان اور شعر کا نکھار ہوتا ہے۔ فانی نے اس کمی کو شعر کا پہلا مصرعہ بدل کر بڑی خوبصورتی سے پورا کر دیا۔ دوسرا شعر جس پر فانی نے دو بار صاد لگائے تھے وہ یہ تھا۔

ان کے جلووں میں گھر گیا آخر
ذرہ کو آفتاب ہونا تھا

اس دوسری اصلاح کے بعد مجاز فانی کے اور قریب ہو گئے اور اب پہلے سے زیادہ جگر کاری سے غزل کہنے لگے۔ لیکن جب تیسری بار مجاز نے فانی سے اصلاح لی تو ان کے طبع نازک کو کچھ چوٹ سی لگی جس کا سبب یہ تھا کہ مجاز نے جو غزل بڑے ناز سے کہی تھی اس کے مطلع کو فانی نے صرف مہمل ہی قرار نہیں دیا بلکہ ان کو نصیحت بھی کی تھی

کہ "حضرت برسوں کی راہ ایک دن میں طے کرنا چاہتے ہو" مجاز کی خود دار طبیعت کو فانی کی یہ نصیحت گراں گذری اور انھوں نے اصلاح کا سلسلہ منقطع کر کے اپنے ذوق ہی کو رہبر قرار دیا۔ مجاز کا شعر جس پر فانی کو اعتراض تھا اور جس کو انھوں نے مہمل قرار دیا تھا حسب ذیل ہے۔

یوں مسکرائے رخ سے اٹھا کر نقاب کو
کچھ بجلیوں نے گھیر لیا آفتاب کو

اس شعر پر بقول ڈاکٹر محمد حسن فانی نے کہا تھا کہ "تبسم لب پر ہوتا ہے کہ چہرے کے چاروں طرف" فانی کا یہ اعتراض صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ جب تبسم ہونٹوں پر آتا ہے تو چہرے سے اس کی کیفیت اور ایک قسم کی حسن آمیز بشاشت ظاہر ہونے لگتی ہے اور یہ اثر فطری ہوتا ہے۔ مجاز نے شعر میں کہیں یہ نہیں کہا ہے کہ تبسم چہرے پر یا چہرے کے چاروں طرف ہوتا ہے بلکہ مفہوم یہ ہے کہ تبسم کے اثر سے سارا چہرہ روشن ہو گیا ہے۔ مجاز فانی کے اعتراض پر کچھ اس طرح خفا ہوئے کہ انھوں نے اپنی خود اعتمادی کا سہارا لے کر فانی کی مشہور غزل پر "ٹالے ہوئے تو ہیں سنبھالے ہوئے تو ہیں" قافیہ بدل کر غزل کہی اور موقع پا کر فانی کو سنائی جس پر فانی نے مجاز کو سخنورانہ داد دی۔ یہ غزل مجاز کے مجموعہ کلام "آہنگ" میں بھی شامل ہے۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سینے میں ان کے جلوے چھپائے ہوئے تو ہیں
ہم اپنے دل کو طور بنائے ہوئے تو ہیں

تیرے گناہگار گناہگار ہی سہی
تیرے کرم کی آس لگائے ہوئے تو ہیں
یوں تجھ کو اختیار ہے تاثیر دے نہ دے
دستِ دعا ہم آج اٹھائے ہوئے تو ہیں
ہاں کیا ہوا وہ حوصلۂ دید اہلِ دل
دیکھو نہ وہ نقاب اٹھائے ہوئے تو ہیں
مٹتے ہوؤں کو دیکھ کے کیوں رو نہ دیں مجازؔ
آخر کسی کے ہم بھی مٹائے ہوئے تو ہیں

یہ تھی صحیح معنوں میں مجازؔ کی پہلی کوشش جس نے ان کی صلاحیت شعری کی طرف اہل ذوق و نظر کو متوجہ کیا۔ اسی غزل کی داد دیتے ہوئے فانیؔ نے کہا تھا کہ "میاں تمہاری غزلوں میں نشاط کا رنگ ہے میرا غم تمہاری جوانی اور نشاط کو روند ڈالے گا آئندہ مجھ سے اصلاح نہ لیا کرو۔" مجازؔ کو فانیؔ کا یہ مشورہ بڑی حد تک حقیقت پر مبنی تھا کیونکہ فانیؔ یاسیات کے امام اور مجازؔ رعنائی جمال کے پرستار تھے۔

مجازؔ کے اس ابتدائی دور پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اول اول وہ فانیؔ سے اپنے کو بہت قریب پاتے تھے اور ان کے رنگ شاعری سے متاثر بھی تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے حساس اور خوددار طبیعت پائی تھی اور ان کو اپنی قوت شعری پر جوان مردانہ اعتماد تھا۔

مجازؔ کی باقاعدہ شاعری کا آغاز ان کے مجموعہ کلام کے مطابق ۱۹۳۱ء سے ہوتا ہے جب کہ وہ آگرہ چھوڑ کر علی گڑھ آ گئے تھے۔

علی گڑھ آکر اس نوجوان رومان پرست شاعر نے اس انداز سے غزل کا ساز چھیڑا کہ ہر طرف سے داد و تحسین کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور بہت جلد مجاز شعری ذوق رکھنے والوں کی نظروں کا مرکز بن گئے۔ اس عرصہ میں مجاز نے ایک نظم "نمائش" اور تین غزلیں کہیں۔ ان کی اس دور کی غزلیں عشق کی رندانہ جرأت حسن سے والہانہ رغبت اور ساز و جام کے پرکیف گداز سے معمور ہیں۔ مجاز کی یہ خوبی ان کے کلام میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں۔

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے
ہاں ذرا جرأت دکھا اے جذبِ دل
حسن کو پردے پہ اپنے ناز ہے
آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم
میری میخواری ابھی تک راز ہے

(غزل۔ گوش بر آواز ہے)

اس اک حجاب پہ سو بے حجابیاں صدقے
جہاں سے چاہتا ہوں تم کو دیکھتا ہوں میں

(غزل۔ دیوانہ ہو گیا ہوں)

یہ کس کے حسن کے رنگین جلوے چھائے جاتے ہیں
شفق کی سرخیاں بن کر تجلی سحر ہو کر

(غزل۔ بے خبر ہو کر)

مجاز کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختلف لوگوں کے خیالات جو وہ "صنف غزل" کے بارے میں رکھتے ہیں، پیش کر دیئے جائیں تاکہ مجاز کی غزل گوئی پر کافی حد تک روشنی پڑ سکے۔ کیونکہ مجاز کی غزل گوئی پر کچھ لوگوں نے اعتراضات کیئے ہیں اس صورت میں ان کے اعتراضات کا معقول جواب بھی دیا جا سکے گا۔

غزل کو رشید احمد صدیقی نے "اردو شاعری کی آبرو" کہا ہے۔ فراق کے نزدیک "غزل کی شاعری" کل شناس اور ہمہ دان ہوتی ہے۔ چونکہ انسان میں خدا کی سی کلیت بھی ہے اس لئے غزل کے ذریعہ سے کائنات کی ہم آہنگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ "نگار کا ایک نقاد تو یہ پیشین گوئی کرتا ہے کہ "مستقبل کا شاعر غزل کی آواز پر آواز دے گا اس لئے غزل کا موضوع انسان اور انسانیت ہے۔ غزل میں ہم آپ ہوتے ہیں اور کائنات کے مجموعی تاثرات ہوتے ہیں اور ہمارے وہ مرکزی جذبات جن کی حیثیت عالم گیر ہے"۔ حالی بھی جو غزل کی اصلاح چاہتے ہیں، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ "جس آسانی سے غزل کے اشعار یاد ہو سکتے ہیں کوئی کلام یاد نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر یوسف حسین نے غزل گوئی کو "رمزیت کی معراج" کہا ہے۔ اختر انصاری کے جامع الفاظ میں "اردو غزل آمد و آورد، بلند و پست، تلخ و شیریں، داخلیت و خارجیت، رکاکت و متانت، مادیت و روحانیت، واقعیت و تخئیلیت اور رضیت و مادرائیت کا ایک عجیب و غریب، حسین و جمیل، رنگارنگ، پُربہار اور پُرکیف مجموعہ ہے۔" پروفیسر آل احمد سرور نے کہا ہے کہ "غزل گوئی اچھی ہو یا بُری ہماری تہذیب کی ایک روایت ہے۔ غزل کو وہ صحیح ہے

جس کے پاس کوئی صلیب نہیں ہے وہ مجاہد ہے جس کے جہاد کا کوئی خاص مقصد نہیں۔ مگر جس کا خلوص مسلم ہے وہ سپاہی ہے جو لڑنا جانتا ہے۔" متذکرہ بالا اقوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے کلیم الدین کا اعتراض بھی ملحوظ نظر رہے۔ جو وہ مجاز کی غزلوں پر کرتے ہیں۔ کلیم الدین کا اعتراض یہ ہے کہ "ان کی غزلوں میں وہی بے ربطی اور پراگندگی ہے جو صنف غزل کا مخصوص نقص ہے۔ مجاز کی غزلوں میں نوخیز ناپائدار اور خام تجربات ہیں۔ جو کچھ بھی قدر و قیمت نہیں رکھتے جن میں کوئی انفرادی شان نہیں۔"

کلیم الدین تہذیب کی اس روایت اس خلوص اور سپاہیانہ انداز سے تجاہل برتتے ہیں جس کی طرف پروفیسر آل احمد سرور نے اشارہ کیا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلیم الدین کو غزل کے ساتھ ایسا تعصب ہے جو نفسیاتی گرہ بن چکا ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی وہ اپنے کئی مضامین میں غزل کو "نیم وحشی صنف سخن" کہہ چکے ہیں۔ اگر کلیم الدین کے اس فتوے کو غزل کے حق میں صحیح تسلیم کر لیا جائے تو غالب میر اور مومن کی تمام تر عظمت جو ان کی غزلوں سے قائم ہے ختم ہو جائے گی اور اردو شاعری کے سرمایہ کی کوئی قدر باقی نہیں رہے گی۔ اس کے علاوہ بقول اختر انصاری "اس اعتراض کی چھان بین کی جائے تو طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اول تو وحشت اور تہذیب کے معیار قائم کرنے ہوں گے پھر یہ تحقیق لازم آئے گی کہ معترض نے غزل کو اس کی مضمونی حیثیت کے لحاظ سے نیم وحشی قرار دیا ہے یا ظاہری ہیئت کے اعتبار سے۔ ممکن ہے اس خیال سے بھی بحث میں الجھن پیدا ہو کہ بعض لوگوں کے

مجاز

عقیدے میں شاعری وحشت و بربریت یا جہل و تاریکی کے ماحول ہی میں فروغ پاتی ہے۔ غرض کہ ان مبہم اعتراض پر کوئی مفید مطلب گفتگو نہیں کی جاسکتی" کلیم الدین کے برعکس ڈاکٹر محمد حسن مجاز کی غزل گوئی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں کہ "ان کی ابتدائی غزلوں کے اشعار میں کہیں شوخی کبھی جھلک اٹھتی ہے۔ کبھی ایک والہانہ لہک اور اک خارجیت پسند تازگی جو برابر بتاتی ہے کہ یہ غزل گو کا خلوت خانہ نہیں کسی کی جلوہ گاہ ناز ہے۔ جہاں ہر لمحہ شمع محفل داغ بھی دیتی ہے اور پھول بھی برساتی ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن کے اس بیان سے کافی حد تک اتفاق کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ شوخی والہانہ لہک اور تازگی کا اقرار کرتے ہوئے جلوہ گاہ ناز اور شمع کا ذکر بھی کرتے ہیں اور جو غزل کی ممتاز خصوصیات ہیں۔

مجاز کی ان غزلوں کے علاوہ ان کی نظم "نمائش" سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ یہ نظم انھوں نے علی گڑھ کی نمائش سے متاثر ہوکر کہی تھی۔ یہ ان کی بھرپور جوان نظم ہے اس میں انھوں نے پرانی شاعری کے خیالی محبوب کی پرستش نہیں کی ہے بلکہ اپنی دنیا کی جیتی جاگتی عورت کے مختلف روپ پیش کئے ہیں اور اس کے اک اک عضو کی تفصیل تناسب کے ساتھ دکھائی ہے جس سے نظم میں ایک خوشگوار لذتیت پیدا ہوگئی ہے۔ تشبیہ اور استعارے اس قرینے سے برتے ہیں کہ پوری نظم نگار خانہ معلوم ہوتی ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی مجاز فنکارانہ قدرت رکھتے ہیں۔ نظم کے چند اشعار مثال کے طور پر درج کئے جاتے ہیں :-

ادائے ناز غرق کیف صہبا
سیہ مژگاں شراب آلودہ نشتر
چمک تاروں کی چشم سرمگیں میں
جھلک چاندی کی جسم مرمریں پر
تبسم اور ہنسی کے نرم طوفاں
فضاؤں میں مسلسل بارشِ زر
وہ محرابیں سی سینوں پر نمایاں
فضائے نور میں کیوپڈ کے شہپر
کوئی آئینہ دار حسنِ فارس
کسی میں حسن یونانی کے جوہر
کسی میں "عکس معصوم کلیسا"
کسی میں پرتو اصنام آذر
یہ اپنے حسن میں عذرائے وامق
وہ اپنے ناز میں سلمائے اختر
یہ تابانی میں خورشید درخشاں
وہ رعنائی میں اس سے بھی فزوں تر
ہنسی اس کی طلوع صبح خنداں
نوا اس کی سرود کیف آور
یہ شعلہ آفریں وہ برق افگن
یہ آئینہ جبیں وہ ماہ پیکر

(نظم "نمائش")

مجاز کی اس نظم میں جو رومانی تصور کارفرما ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کا کہنا ہے کہ "مجاز کی اس نظم پر اختر شیرانی کے رومانی انداز نظر کی اور تصوریت کی چھاپ نمایاں ہے"۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ جن شعرا سے مجاز کی شاعری نے اثرات قبول کئے ہیں ان میں اختر شیرانی بھی ہیں۔ نظم میں "سلمیٰ" کا ذکر اس کی طرف کھلا ہوا اشارہ ہے۔ اعظمی صاحب کے بیان کی تائید پروفیسر آل احمد سرور کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ "مجاز کے لہجے میں اختر شیرانی کی سپردگی اور والہانہ پن کے ساتھ نغمگی اور شیرینی کچھ زیادہ ہے"۔

۱۹۳۶ء کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ مجاز کو غزل کا ساز اور غزلیت کی دُھن زیادہ مرغوب ہے۔ وہ اسی ساز پر نت نئے انداز سے نغمے الاپتے رہتے ہیں اور شوق شوریدہ کے ہنگاموں کی چاہت بھی رکھتے ہیں۔ وہ محبت کے جنون خام کی آرزو بھی کرتے ہیں اور نغمہ و صہبا کی مستی سے لطف بھی لیتے ہیں۔ وہ مزدور اور کسان کی زندگی کی پامالیوں کو دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ محسوس بھی کرتے ہیں۔ ان کی محبت بھری تیز نظریں حسن کے اک اک پردے سے گذرنا چاہتی ہیں اور وہ اپنی قوت مشاہدہ کو حسن کے سہارے سے بڑھانا بھی چاہتے ہیں۔ وہ محبت کے ہر نازک جذبے کو خوبصورت الفاظ اور دلنشیں تشبیہات اور استعارات سے آراستہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے سلیقے کے ساتھ چنے ہوئے الفاظ میں ایسا دلکش آہنگ ہوتا ہے جو بے اختیار

دلوں کو موہ لیتا ہے۔ اختر انصاری نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ "ہمیں مجازؔ کے یہاں شروع سے آخیر تک نہایت رچی ہوئی فارسیت آمیز زبان ملتی ہے۔ انکے مصرعوں میں کہیں جھول نہیں پڑتا۔ بندشوں کی چستی اور ترکیبوں کی خوشنمائی میں کبھی فرق نہیں آتا۔ ناپختگی اور کھدراپن جو اردو کے اکثر نئے شاعروں کی عام خصوصیت ہے مجازؔ کے یہاں یکسر مفقود ہے۔" مجازؔ کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ سادہ لفظوں کو استعمال کرتے ہوئے بھی محبت کے ہر لطیف خیال کو اس کی پوری لطافت کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ ان کی نازک طبیعت حسن اور صرف حسن کی پرستار ہے اور وہ حسن ہی میں کھو جانا چاہتے ہیں۔ وہ جب فطرت کی طرف آنکھ اٹھاتے ہیں تو سبزہ و گل کے ہر رمز اور ہر جنبش سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ چاند سورج بادل صبح و شام غرض فطرت کے ہر انداز سے متاثر ہوتے ہیں۔ مجازؔ کا یہ دور گذشتہ دور سے بہت زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ انھوں نے اس عرصہ میں پانچ غزلیں اور دو نظمیں کہی تھیں جن میں ایک ٹیگور کے مجموعہ "گارڈنر" کی ایک نظم کا ترجمہ ہے۔ دوسری نظم کا عنوان "ایک دوست کی خوش مذاقی پر" ہے۔ مجازؔ کی یہ نظم بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مجازؔ کی اس نظم سے ان کی شاعری میں اک نئے میلان کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے انگریزی کے مشہور شاعر ورڈسورتھ کی ایک نظم کے تصورات منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کا اپنا شعری مزاج اس میں اس طرح داخل ہو گیا ہے کہ یہ نظم طبع زاد کا حکم رکھتی ہے۔ اس نظم میں مجازؔ ایک

دوست کی خوش مذاقی پر ایک لطیف طنز کرتے ہیں اور اسے ہاتھوں سے کتاب پھینک دینے کی ترغیب دیتے ہوئے فطرت کی رنگا رنگ رعنائیوں کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ مجاز اور ورڈسورتھ دونوں کی نظموں سے کچھ ٹکڑے پیش کئے جاتے ہیں۔

ہو نہیں سکتا تری اس خوش مذاقی کا جواب
شام کا دلکش سماں اور تیرے ہاتھوں میں کتاب
رکھ بھی دے اب اس کتاب خشک کو بالائے طاق
اڑ رہا ہے رنگ و بو کی بزم میں تیرا مذاق
دیکھ کر یہ شام کے نظارہ ہائے دلنشیں
کیا ترے دل میں ذرا بھی گدگدی ہوتی نہیں
حسن فطرت کی لطافت کا جو تو قائل نہیں
میں یہ کہتا ہوں تجھے جینے کا حق حاصل نہیں

(نظم "ایک دوست کی خوش مذاقی پر")

(1) Books 'Tis a dull and Endless Strife
Come, Hear the wood_Land Linnet
How Sweet is his Music on my life
Ther's more of wisdom in it.

(2) One Impulse from a Vernal wood
May Teach you more of man
Of Moral Evil and of good
Than all the sages can.

HaSnain Sialvi

مجاز کی اس دور کی غزلوں کے بھی چند اشعار پیش ہیں۔

ابھی رہنے دے دل میں شوق شوریدہ کے ہنگامے
ابھی سر میں محبت کا جنون خام رہنے دے
ابھی رہنے دے کچھ دن لطف نغمہ مستی صہبا
ابھی یہ ساز رہنے دے ابھی یہ جام رہنے دے

(غزل "آلام رہنے دے")

تجھے ڈھونڈتا ہوں تری جستجو ہے
مزا ہے کہ خود گم ہوا چاہتا ہوں
وہ مخمور نظریں وہ مدہوش آنکھیں
خراب محبت ہوا چاہتا ہوں

(غزل "ہٹا چاہتا ہوں")

آنکھ سے آنکھ جب نہیں ملتی
دل سے دل ہمکلام ہوتا ہے

(غزل "نام ہوتا ہے")

یہ میری دنیا یہ میری ہستی
نغمہ طرازی صہبا پرستی

(غزل "یہ میری ہستی")

۱۹۳۳ء میں غزل کا بھرپور راگ الاپنے والے مجاز کی زیادہ تر توجہ نظم کی طرف ہو جاتی ہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے تین غزلیں اور چار نظمیں کہی ہیں۔ مجاز کی اس دور کی شاعری میں انگریزی کے رومانی شاعروں بالخصوص شیلی اور کیٹس کے اثرات محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی

نظم "آج کی رات" انھیں شیلی سے زیادہ قریب کردیتی ہے۔ اس نظم میں مجاز کی حسن پرستی کا جذبہ اپنے شباب پر ہے۔ ان کی جمال پرست نظریں جس طرف بھی اٹھتی ہیں حسن کے نرم طوفانوں سے دوچار ہوتی ہیں۔ وہ سنگ ریزوں پر لعل و گہر کا گمان کرتے ہیں در و دیوار سے نور کا سیلاب پھوٹتا ہوا دیکھتے ہیں ہر خار گلستان بکنار نظر آتا۔ وہ محبوب کے حسن کو فطرت پر بھی غالب پاتے ہیں۔ چاند اس کو دیکھ کر اپنا رخت سفر پھینک دیتا ہے۔ زمین سے زندگی کا طوفان ابلنے لگتا ہے۔ موت روپوش ہو کر بھی لرزنے لگتی ہے اور نغمہ و نور کی بارش سے ان کی محفل انھیں خیام کا گھر معلوم ہوتی ہے۔ وہ حسن کے اک اک انداز کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور اس سے محظوظ بھی ہوتے ہیں۔ وہ محبت کے باریک سے باریک اور نازک سے نازک احساس کی گرفت کرنے میں بڑی فنکارانہ قدرت رکھتے ہیں اور انکی یہ قدرت مشاہدے کی گہرائی ان کے تخیل کی پرواز کا پتہ دیتی ہے۔ ان کی شوخ نظریں اور شیریں نغمے جن کا انھیں خود بھی احساس ہے حسن کو اور بھی دلکش بنا دیتے ہیں۔ مجاز کی یہ نظم اک حسین پیکر ہے جو رنگ و نور میں ڈھلا ہوا ہے۔ ان کی اس نظم کے ہر مصرعے میں اک لطیف موسیقیت محسوس ہوتی ہے جو الفاظ کی نازک ترکیب سے پیدا ہوتی ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دیکھنا جذب محبت کا اثر آج کی رات
میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات

پھول کیا خار بھی ہیں آج گلستاں بکنار
سنگریزے ہیں نگاہوں میں گہر آج کی رات
نور ہی نور ہے کس سمت اٹھاؤں آنکھیں
حسن ہی حسن ہے تا حد نظر آج کی رات
نرگس ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار
وہ مرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات
وہ تبسم ہی تبسم کا جمال پیہم
وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات
نغمہ و مے کا یہ طوفان طرب کیا کہیے
گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات

ان کی دوسری کامیاب نظم "نذر خالدہ" ہے۔ جس کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس نظم میں مجاز نے مہمان کی آمد کی خوشی کا اظہار بڑے حسین پیرائے میں کیا ہے اور مہمان کی صفات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مجاز اپنے گرد و پیش کے ہر دامان پر در منظر کو اپنے ساتھ لے کر توصیفی انداز اختیار کرتے ہیں اور مہمان کے اک اک خال و خط کو اپنی عقیدت مند اور پر کیف نظر کی جنبش سے اجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور اپنی فنکارانہ قدرت سے کام لے کر ہر مصرع میں بڑی وسعت پیدا کر دیتے ہیں۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور "خالدہ خانم کی پوری شخصیت کے سمندر کو مجاز نے ایک مصرع کے کوزے میں بند کر لیا ہے۔"

روح عشرت گاہ ساحل جان طوفان عظیم

مجاز کی نظم "رات اور ریل" ان کے نئے عزم اور ایک خاص مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے اور نئے رجحانات اور اک نئے پیغام کی حامل ہے۔ انھوں نے رات اور ریل کو اپنا موضوع بنا کر ہمارے جذبہ آزادی کو جگایا ہے اور اپنے دور کو سنگین حقیقتوں سے آگاہ کیا ہے۔ رات اور ریل ہمارے اندر منزل مقصود کی طرف بڑھتے جانے کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ شاعر کی تیز نظر زمانہ کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ اور سمجھ رہی ہے۔

نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جستجو میں منزل مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی
آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آجائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ دراتی ہوئی
ایک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار
عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
وہ ہوا میں سینکڑوں جنگلی دھل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جانفزا آواز لہراتی ہوئی

الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعر آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

(نظم - رات اور ریل)

اب مجاز کے ہاتھوں میں انقلاب کا ساز نظر آتا ہے۔ ان کی نظم "انقلاب" اس کا ایک پختہ ثبوت ہے۔ اس نظم میں مجاز نے اپنے فرض کو پہچان کر اس کے پورا کرنے کا ایک عہد کیا ہے اور سارے سماجی اور سیاسی نظام پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ مجاز رعایا کی زندگی کے لئے حکومت سے کچھ مطالبات بھی کرتے ہیں اور فریاد کا وہ پہلو اختیار کرتے ہیں جس میں غلامی کے احساس کا کرب ملتا ہے۔ وہ حکومت کو بھوک سے مارے ہوئے انسانوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور مزدوروں کی بدحالی کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ وہ حکومت کو اس کا بھی احساس دلاتے ہیں کہ رعایا کی موجودہ حالت نہیں بدلی تو انقلاب کی زبردست آندھی قیامت برپا کر دے گی۔ اور اس طوفانی رو سے عابد و زاہد کیا اور سرمایہ دار کیا کسی کو بھی مفر نہ ہوگا۔ اس نظم میں مجاز مارکیسٹ سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ملک کو غلامی سے نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور برطانوی سامراج کے خلاف نعرہ بلند کرتے ہیں۔ ان کے خون میں آزادی کی اک لہر دوڑی ہوئی ہے۔ وہ شبستان حسن سے نکل کر آزادی کے میدان میں جدوجہد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ادب کے ذریعہ مفلس مزدور اور فاقہ مست کی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ وہ موسیقی کی سحرکاری کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر اس کو زندگی کی راہ میں

اک رکاوٹ پاتے ہیں۔ اب وہ غنائی شاعر نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ شمشیر بکف سپاہی معلوم ہوتے ہیں جو اپنی منزل مقصود کی طرف پُرجوش انداز میں بڑھ رہا ہے۔

نظم انقلاب کے چند مختلف اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں ـــ

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ پیچھا چھوڑ دے
کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے
تیری تانوں میں ہے ظالم کس قیامت کا اثر
بجلیاں سی گر رہی ہیں دامن ادراک پر
میں نے مانا وجد میں دنیا کو لا سکتا ہے تو
میں نے یہ مانا غم ہستی مٹا سکتا ہے تو
یہ خیال آتا ہے رہ رہ کر دلِ بے تاب میں
بہہ نہ جاؤں پھر ترے نغمات کے سیلاب میں
مجھ کو تیرے سحر موسیقی سے کب انکار ہے
مجھ کو تیرے لحن داؤدی سے کب انکار ہے
فرش گیتی سے سکون اب مائل پرواز ہے
ابر کے پردوں میں ساز جنگ کی آواز ہے
پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شور انقلاب
آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے

ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوشِ انتقام

(نظم "انقلاب")

۱۹۳۴ء میں بھی مجازؔ پر وطن پرستی کا شدید جذبہ غالب تھا وہ آزادی کے ولولہ میں مذہب کی دیوار بھی پھاند جاتے ہیں۔ اور شیخ و برہمن اور کعبہ و دیر کے بھی قائل نہیں رہتے۔ ان کا یہ میلان کبھی نظم اور کبھی غزل کی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ان کی نظم "شوقِ گریزاں" ان کے اس احساس کا مکمل اظہار ہے۔

دیر و کعبہ کا میں نہیں قائل
دیر و کعبہ کو آستاں نہ بنا
مجھ میں تو روحِ سرمدی مت پھونک
رونقِ بزمِ عارفاں نہ بنا
عشرتِ جہل و تیرگی مت چھین
محرمِ رازِ دو جہاں نہ بنا

(نظم "شوقِ گریزاں")

۱۹۳۵ء میں زلف و رخ کا پرستار شاعر جنسی شعور کی راہوں سے گزر کر سماجی شعور کی حدود میں آجاتا ہے اور زندگی کے نئے تجربات اس کو نئی سمتوں کا احساس دلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اب مجازؔ اپنا تعارف بھی کراتے ہیں تو خود کو کبھی شاعرِ بیداد کبھی "لپکتا ہوا شعلہ" اور کبھی چلتی ہوئی تلوار کہتے ہیں۔ کبھی ماہ و انجم پہ کمندیں ڈالتے ہیں تو کبھی نوعِ انسان کی پرستاری کا دم

ابھرتے ہیں۔ کبھی اپنی وارفتہ روی کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو کبھی فتنۂ عقل سے بیزاری کا اظہار۔ مجاز کے رجحانات اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ ان کو خود اپنی طاقتوں کا پورا احساس تھا۔ ان کی نظم "تعارف" ان خاص نظموں میں سے ایک ہے جو ان کی شخصیت اور مزاج کا تعین کرتی ہے۔ یہ نظم ایک طرح سے مجاز کے بدلتے ہوئے میلان کا اعلان بھی ہے۔

نظم کے چند شعر بطور نمونہ پیش ہیں۔

عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

خواب عشرت میں ہیں ارباب خرد
اور اک شاعر بیدار ہوں میں

زندگی کیا ہے گناہ آدم
زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے
اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں

محفل دہر پہ طاری ہے جمود
اور وارفتۂ رفتار ہوں میں

اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں
ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

(نظم "تعارف")

اسی عرصہ میں مجاز نے "خانہ بدوش" کے علاوہ "جشن سالگرہ" کے

عنوان سے نظم لکھ کر پھر اس عورت کی تصویر کھینچی ہے جو "نمائش" کی "دوشیزگان نازپرور" کی طرح معصوم اور نوخیز ہونے کے بجائے دوشیزگی کا احساس بھی رکھتی ہے اور آنکھوں میں چھلکتے ہوئے خواب بھی۔ اس کے ہونٹوں پر شرم وحیا سے خامشی کا قفل لگا ہوا ہے اور جوانی کے بوجھ سے آنکھیں جھکی ہوئی ہیں۔ مگر یہ جھکی ہوئی آنکھیں دبے ہوئے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ شاعر اس موقع سے بے نیازانہ گزر جائے یہ ممکن نہ تھا۔ آخر اس کے ذوق پرستش کے احساس نے اس کو مجبور کر دیا اور اس کی وفائیں بے ساختہ دست قدرت کے تراشے ہوئے حسین مجسمہ کی طرف بڑھ گئیں۔ اور اس کے قدم چومنے کے لئے مجبور ہوگئیں۔

مجاز نے اس تصویر کے بنانے میں بڑی فنکارانہ قدرت سے کام لیا ہے۔ جذبہ کی حرارت کو اس طرح سمویا ہے کہ تصویر کے منہ میں خود بخود زبان پیدا ہوگئی ہے۔ ایسی تصویریں مجاز کے ہمعصروں میں کمیاب ہیں۔ نظم کے آخری حسب ذیل دو بندوں میں مجاز نے اس کو جو والہانہ دعائیں دی ہیں ان کے بارے میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کا خیال ہے کہ "ان دعاؤں کے پردے میں خود اپنے دل کی کلی کھلنے کی تمنا بھی تھی۔"

اے تو کہ ترے دم سے مری زمزمہ خوانی
ہو تجھ کو مبارک یہ تری نور جہانی
افکار سے محفوظ رہے تری جوانی

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں تری آنکھوں کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

(نظم۔ جشن سالگرہ)

۱۹۳۶ء میں مجاز نے ایک غزل اور چھ نظمیں لکھیں۔ ان میں "نذر دل" اور "نذر علی گڑھ" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔
"نذر دل" میں شاعر نے سماج کے ان کہنہ اور فرسودہ قوانین توڑنے کی کوشش کی ہے جو عورت پر مسلط ہیں۔ شاعر اس کو آزاد کر کے اپنے ہمراہ لیکر اک تازہ انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کی راہ میں اپنا دل اور اپنی آنکھیں تک بچھانے کے لئے تیار ہے۔ وہ اس کو مہ و انجم کی محفل میں بٹھانے اور اس کے سر پر تاج کشور نور رکھنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ اس کی خاطر وہ زلیخا تک سے اپنا دامن بچا سکتا ہے۔ لیکن سماج کے مسلط کئے ہوئے قوانین اتنے سخت ہیں کہ شاعر کی یہ آرزو محض آرزو رہ جاتی ہے۔ مجاز اس نظم میں عورت کو مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کی دعوت دیتے ہوئے اس طرح خطاب کرتے ہیں۔

آ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

(نظم۔ نذر دل)

"نذر علی گڑھ" مجاز کی وہ مقبول نظم ہے جو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ترانہ ہے۔ جب تک یونیورسٹی قائم رہے گی مجاز کا نام بھی اس ترانے

کے ساتھ علی گڑھ کی فضا میں گونجتا رہے گا۔ اگر اتفاق سے مجاز کے تمام کلام کو گمنامی کا منہ دیکھنا پڑا تو ان کی تنہا نظم (نذر علی گڑھ) ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ اس نظم میں انھوں نے تعلیمی ادارے کی تہذیبی عظمت پر روشنی ڈالی ہے جس نے انکی بالغ نظری ادبی مذاق اور سوچنے سمجھنے کا سلیقہ بخشا۔ اور شعری ذوق کو نکھارنے میں بڑی حد تک مدد دی۔ مجاز نے یہ نظم لکھ کر اپنا وہ فرض پورا کیا ہے جو ایک تعلیمی ادارے کی طرف سے طالب علم پر عائد ہوتا ہے۔ اس نظم کو ان کے جذبہ عقیدت فنکارانہ حسن کاری اور نادر تشبیہات نے ایک دلکش اور لازوال شاہکار بنا دیا ہے۔ انھوں نے ادارے کے استادوں طالب علموں تہذیب و تربیت اور ماحول کو بڑے سلیقہ اور اہتمام سے پیش کیا ہے۔

نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں ----

جو طاق حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات ابلتی ہے

اسلام کے اس بتخانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس میخانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی

یہ دشت جنوں دیوانوں کا یہ بزم وفا پروانوں کی
یہ شہر طرب رومانوں کا یہ خلد بریں ارمانوں کی

اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں

جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا

مجاز

یہ جوئے رواں پر برسے گا ہر کوہ گراں پر برسے گا
ہر سرو و سمن پر برسے گا ہر دشت و دمن پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا غیروں کے چمن پر برسے گا
ہر شہر طرب پر گرجے گا ہر قصر طرب پر کڑکے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے یہ ابر ہمیشہ برسے گا

(نظم۔ نذر علی گڑھ)

مجازؔ کی اس دور کی باقی نظمیں "مجبوریاں" "نورا" "ننھی پجارن" اور "دلی سے واپسی" وغیرہ بھی قابل قدر نظمیں ہیں۔ ہر نظم اپنے مخصوص تیور مخصوص انداز اور اپنی یکتائی کی خود ضامن ہے۔ جیسا کہ متذکرہ بالا نظموں کے مختلف اشعار سے ثابت ہوتا ہے۔

ہوس کاری ہے جرمِ خودکشی میری شریعت میں
یہ حدِ آخری ہے میں یہاں تک جا نہیں سکتا
نہ طوفاں روک سکتے ہیں نہ آندھی روک سکتی ہے
مگر پھر بھی میں اس قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا
وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا

(نظم۔ "مجبوریاں")

وہ اک نرس تھی چارہ گر جس کو کہئے
مداوائے دردِ جگر جس کو کہئے
جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی
ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی

ہنسی اور ہنسی، اس طرح کھلکھلا کر
کہ شمع حیا رہ گئی جھلملا کر

(نظم "نورا")

بھور بھئے مندر آئی ہے — آئی نہیں ہے لائی ہے
وقت سے پہلے جاگ اٹھی ہے — نیند ابھی آنکھوں میں بھری ہے
دھوپ چڑھے تارا چمکا ہے — پتھر پر اک پھول کھلا ہے
خود تو آئی ہے مندر میں — من اس کا ہے گڑیا گھر میں

(نظم "ننھی پجارن")

جاتے جاتے لیکن اک پیمان کیے جاتا ہوں میں
اپنے عزم سرفروشی کی قسم کھاتا ہوں میں
پھر تری بزم حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤں گا میں اور باندازِ دگر آؤں گا میں
فطرت دل دشمن نغمہ ہوئی جاتی ہے اب
زندگی اک برق اک شعلہ ہوئی جاتی ہے اب
سر سے پا تک ایک خونی راگ بن کر آؤں گا
لالہ زار رنگ و بو میں آگ بن کر آؤں گا

(نظم "دلی سے واپسی")

۱۹۳۷ء میں مجاز کی پوری توجہ نظم پر ہو گئی تھی۔ اس عرصہ میں انھوں نے مختلف عنوانوں سے دس نظمیں لکھیں۔ ان کی ہر نظم یوں تو ایک خاص انداز اور مخصوص تیور لئے ہوئے ہے لیکن اس دور کی چند نظمیں جن میں "اندھیری رات کا مسافر" "نوجوان سے" "نوجوان

خاتون سے" اور "آوارہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انگریزی کے مشہور شاعر براؤننگ نے کہا تھا کہ "خدا اپنے آسمان پر ہے اور دنیا میں سب خیریت ہے۔" لیکن "اندھیری رات کا مسافر" اس کے برعکس خدا کو سویا ہوا اہرمن کو تحشر بداماں اور فضا میں ہر طرف موت کے تاریک سائے تھرتھراتے ہوئے دیکھتا ہے۔ ہمسفروں میں کوئی زخمی اور کوئی گھائل پاتا ہے۔ راستہ میں ایک طرف چٹانیں حائل ہیں تو دوسری طرف لٹیرے تعقب میں ہیں۔ نہ چراغ دیر سہارا دیتا ہے نہ قندیل حرم راہ دکھاتی ہے۔ مگر پھر بھی وہ اپنے عزم مستحکم کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اس نظم میں شاعر کا مسافر تاریکیوں کو چیرتا ہوا اور گرد و پیش کے ہر طوفان اور حکومت کے ہر جبر و تشدد کا مردانہ وار مقابلہ کر رہا ہے اور یہ کہتے ہوئے اپنی منزل مقصود یعنی آزادی کی جستجو میں سرگرم سفر ہے کہ

حکومت کے مظاہر جنگ کے پرہول نقشے ہیں
کدالوں کے مقابل توپ بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل تازیانے بیڑیاں پھانسی کے تختے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

افق پر جنگ کا خونیں ستارا جگمگاتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلب گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

(نظم — "اندھیری رات کا مسافر")

مجازؔ ایک طرف اگر مسافر کی ہمت افزائی کر رہے ہیں تو دوسری طرف نوجوانوں پر بھی ان کی نظریں پڑ رہی ہیں۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور کہ "اس نے نوجوانوں کے عزم سرفروشی و ولولۂ حیات قلندرانہ آن بان جرأت رندانہ اور شوق بیباک کو حسن کے غازے کے طور پر نہیں چمن حیات کی حیابندی کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ ایک طرف وہ نوجوانوں میں ایک مجاہدانہ جوش پیدا کرنا چاہتا ہے دوسری طرف خواتین کو بھی رزم گاہ حیات میں شرکت کی دعوت دیتا ہے"۔

نوجوانوں سے مجازؔ کا یہ طرز تخاطب اور خواتین کو کارزار حیات میں شرکت کی یہ دعوت اردو شاعری میں یقیناً ایک نیا اضافہ ہے اگر اس سے قبل اردو شاعری کے سرمایہ پر نظر ڈالی جائے تو کہیں بھی نوجوانوں کو اس انداز سے ان کی طاقت عظمت اور اہمیت کا احساس نہیں دلایا گیا ہے۔ یہ صرف مجازؔ ہی کا اپنا انداز ہے جو وہ نوجوانوں سے کہتے ہیں کہ ؎

جلال آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
ترے خرام میں ہے زلزلوں کا راز نہاں
ہر ایک گام پر اک انقلاب پیدا کر
جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر
بہے زمیں پہ جو میرا لہو تو غم مت کر
اسی زمین سے مہکتے گلاب پیدا کر

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

(نظم۔ "نوجوان سے")

اسی طرح وقت کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے مجاز نوجوان خاتون کو بھی خطاب کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

حجابِ فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کو پردہ بنا لیتی تو اچھا تھا
سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل کو اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

(نظم۔ "نوجوان خاتون سے")

مجاز کا المیاتی احساس اور ان کی غنائیت جس کا ان کی شخصیت کے جمالیاتی گوشوں سے براہِ راست تعلق ہے ان کے پورے کلام میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ ان کے ذہن کی تخلیقی حرارت ان کے تخیل اور تجربے کو گداز کر کے تشبیہات و استعارات کو نئی زندگی بخشتی ہے۔ ان کی بنائی ہوئی ہر تصویر معنویت کے گہرے رنگ کے ساتھ دلکش انداز اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن رفیع اللہ عنایتی کا یہ کہنا ہے کہ "اس کے یہاں معمولی درجہ کا "مشاہدہ" اور معمولی درجہ کا "مجاہدہ" ملتا ہے اور وہ فیض کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔" یہ بحیثیت مجموعی خود ایک ہلکا معمولی اور سطحی اعتراض ہے۔ اسلوب احمد انصاری مجاز کی

شاعری پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں کہ "نظم کے لئے جس منطقی تسلسل پھیلاؤ اور جزئیات نگاری کی ضرورت ہوتی ہے اور خیال جس طرح لمحہ بہ لمحہ اور منزل بہ منزل بساط پر محیط ہوتا چلا جاتا ہے وہ ان کی نظموں میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔" اسلوب احمد انصاری کا یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے۔

مجاز کی نظم "آوارہ" جو حیات اللہ انصاری کے الفاظ میں "عالمی ادب کا ایک حسین پارہ ہے" اس میں معنوی اوصاف کی بنا پر پیلے ماہتاب کو ملا کے عمامے بنیئے کی کتاب مفلس کی جوانی اور بیوہ کے شباب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ان تشبیہات میں مجاز کی داخلی کیفیات ہی کی رنگ آمیزی ہے اور حقیقت کا نئے بہتر اور انوکھے پن سے اظہار ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کا کہنا ہے کہ "آوارہ" میں پوری داستان درد آگئی ہے اور اس داستان میں ایک پوری نسل کے افسانہ و افسون کا المیہ ہے۔" پروفیسر آل احمد سرور نے مختصر الفاظ میں مجاز کی اس نظم پر بہت کچھ کہہ دیا ہے۔

نظم "آوارہ" کے چند بند ملاحظہ ہوں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر رکھی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی

ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب

جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب

جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

(نظم۔ "آوارہ")

مجاز کے ۱۹۳۸ء کے سرمایۂ شاعری میں صرف ایک غزل ایک نظم "جلا وطن کی واپسی" اور ایک "مزدوروں کا گیت" ہے۔ اس مدت کے اندر مجاز نے بہت کم کہا ہے لیکن جو کچھ بھی کہا ہے اس میں ان کے جذبہ کی گرمی اور نغمگی کے حسن نے کہیں ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی لے دھیمی ہو گئی ہے ساز سے نغمے کم پھوٹتے ہیں لیکن ایسا کیوں ہوا اس کا آسان جواب یہ ہے کہ وہ اس دور میں برباد تمنا تھے جیسا کہ وہ خود اپنی غزل میں کہتے ہیں۔

برباد تمنّا پہ عتاب اور زیادہ

ہاں میری محبت کا جواب اور زیادہ

(غزل۔ "عتاب اور زیادہ")

معصومیت اور کس بلا کی معصومیت ہے کہ محبت کے جواب میں عتاب بھی گوارا ہے لیکن اس عتاب میں محبت کا وہ نازک پہلو بھی کارفرما ہے جس کو فطری لگاؤ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مجاز کو اپنی بربادی کا بھی احساس ہے اور وہ لوگوں کی ان نظروں کو بھی دیکھ رہے ہیں جو ان کے حال

خراب پر اٹھ رہی ہیں۔ مگر وہ محبت کی خرابی کو خرابی تصور نہیں کرتے اور صاف کہہ دیتے ہیں ـــ

روئیں نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے
ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ
اٹھیں گے ابھی اور بھی طوفاں مرے دل سے
دیکھوں گا ابھی عشق کے خواب اور زیادہ

(غزل ـ "عتاب اور زیادہ")

یہ عشق کے خواب دیکھنے والا جب ایک جلاوطن کی واپسی کی خبر سنتا ہے تو بڑے خلوص سے یہ کہتا ہوا اس کا خیر مقدم کرتا ہے کہ

رندِ بے کیف کو تھی بادہ و ساغر کی تلاش
ناظرِ منظرِ فطرت کو تھی منظر کی تلاش
ایک بھنورے کو خزاں میں تھی گلِ تر کی تلاش
خود صنم خانۂ آزر کو تھی آزر کی تلاش
مژدہ اے دوست کہ وہ جانِ بہار آ پہنچا
اپنے دامن میں لئے برق و شرار آ پہنچا

لیکن صرف اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اس مردِ سرکش کی شعلہ فشانی اور سوزِ نہانی کی باز پرس ہوتی ہے جنسِ آزادیٔ انسان کی خریداری کا سوال بھی اٹھتا ہے اور ساز و شمشیر کی جانب توجہ دلا کر ایک بڑے اور اہم کام کی اس سے توقع بھی کی جاتی ہے۔ اور کارگہ حیات میں کام آنے والی مخصوص چیزوں کا یوں اظہار ہوتا ہے کہ ـــ

دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

(نظم - "ایک جلاوطن کی واپسی")

یہیں سے مجاز کی شاعری کے وہ تینوں اجزاء ظاہر ہو جاتے ہیں جن کی طرف فیض احمد فیض نے اشارہ کیا ہے یعنی "شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گداز"۔ اور یہ ساز و جام کا گداز رکھنے والا شاعر جب "مزدوروں کا گیت" چھیڑتا ہے تو ان کی مجبوری عزم اور بلند ہمتی کے ہر پہلو کو روشن اور واضح کر دیتا ہے۔ مثلاً

ہر چند کہ ہیں ادبار میں ہم
کہتے ہیں کھلے بازار میں ہم
ہیں سب سے بڑے سنسار میں ہم
مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم
جس روز بغاوت کر دیں گے
دنیا میں قیامت کر دیں گے
خوابوں کو حقیقت کر دیں گے
مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم

("مزدوروں کا گیت")

۱۹۳۹ء میں مجاز کی لے سال گذشتہ کی بنسبت کچھ تیز ہو گئی تھی اور ان کے ساز سے پانچ رنگیے پانچ نغمے پھوٹے یعنی انھوں نے پانچ نظمیں کہیں ان میں "کس سے محبت ہے" "خواب سحر" "شکوۂ مختصر" بہت اہم ہیں۔ مجاز نے اپنی نظم "کس سے محبت ہے" میں

اپنی اس محبوب عورت پر روشنی ڈالی ہے جو محض خیالی نہیں بلکہ ان کی اپنی دنیا کی ایک گوشت پوست کی وہ عورت ہے جو دنیاوی عارضی زیبائش سے بے نیاز ہوتے ہوئے بھی مختلف اوصاف دلکشی اور اعجاز و کرشمہ کی مالک ہے۔ اس کی سادہ مزاجی کا یہ عالم ہے کہ نہ تو لب پر لاکھا ہے نہ رخ پر غازہ اور نہ چمکتی ہوئی پیشانی پہ جھومر و ٹیکا ہے۔ اس کی پڑانی ہی اس کا سہاگ ہے اور اس کا تبسم ہی اس کا گہنا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اک ایسی مضراب ہے جو ساز رگ جاں کو چھیڑ سکتی ہے۔ اک ایسی چنگاری ہے جو گلستان کو پھونکنے کا حوصلہ رکھتی ہے اور اک ایسی بجلی ہے جو بزم امکان کو بھی جلا سکتی ہے۔ وہ ایک ایسی ملکہ ہے جس نے بوستانوں سے خراج لیا ہے۔ اس میں مریم کی شان بھی ہے اور حیا و پاکیزگی کے جوہر بھی ہیں۔ وہ ہمدرد بھی ہے اور وفا آشنا بھی ہے۔ اس کے ہر تیور اور ہر ادا کو مجازؔ نے بڑی گہری اور فنکارانہ نظر سے دیکھا ہے اور بڑی خوبصورتی سے ان کی عکاسی بھی کی ہے۔ نظم کے چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں ۔

وہ اک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھونک سکتی ہے گلستاں کو
وہ بجلی ہے جلا سکتی ہے ساری بزم امکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں شرر سامانیاں اس کی

جبیں پہ سایہ گستر پرتو قندیل رہبانی
عذار نرم و نازک پہ شفق کی رنگ افشانی

قدم پر لوٹتی ہے عظمتِ تاجِ سلیمانی
ازل سے معتقد ہے محفلِ نورانیاں اس کی
لبِ لعلیں پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبینِ نور افشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اس کا تبسم اس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر دامانیاں اس کی
(نظم "کس سے محبت ہے")

مجاز کی نظر جب ان کی حریم صفتِ محبوبہ سے گزر کر روئے انسان پر پڑتی ہے تو وہ انسانیت کے اک اک خال وخط کو اجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی نظم "خواب سحر" اس کا ایک مکمل اور واضح نقش ہے۔ "خواب سحر" کو پروفیسر آل احمد سرور نے مجاز کی بہترین نظموں میں شمار کیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس نظم میں مجاز نے بڑی سنجیدگی اور متانت سے اپنی بات کہی ہے۔ وہ مذہب کے غلط اثر کی مذمت کرتے ہیں اور مذہب پرستوں کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ انسان پر مذہب کو ترجیح دی جائے۔ ان کی نظر میں انسان مذہب سے زیادہ بلند اور اہم ہے۔ وہ مذہب کو انسان کے لئے اہم سمجھتے ہیں انسان کو مذہب کے لئے نہیں۔ ان کا مسلک انسانیت ہے اور ایمان خدمت خلق۔ جب مجاز انسان کے ادراک پر تاریکی کے پہرے دیکھتے ہیں اور آدمیت کو ظلم کی چکی میں پستا ہوا پاتے ہیں تو ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ بے ساختہ یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ۔

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر
رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر
عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا
دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا ہی رہا
اک نہ اک مذہب کی سعیٔ خام بھی ہوتی رہی
اہلِ دل پر بارشِ الہام بھی ہوتی رہی
حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی
ابرِ رحمت بن کے چھایا دہر پر اسلام بھی
آدمی منت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا
اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی

مجاز انسانیت کا ماتم کرتے ہوئے جب زیادہ کرب محسوس کرتے ہیں تو پھر اپنی اس محبوب عورت کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں جس نے ان سے محبت کی ان کو چاہا انھیں اپنی آنکھوں پر بٹھایا اور جس نے تنہائی میں ان کے شعر تک گنگنائے۔ مگر وہی عورت زندگی کے سفر میں ان کے ساتھ نہ چل سکی سماج نے اس کے پیروں میں بیڑیاں پہنا دیں اور مجاز شکست کھا کر سماج کے فرسودہ قوانین کے خلاف شکوہ کر بیٹھے جوان کی نظم "شکوہ مختصر" سے ظاہر ہے۔

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی ان زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوق رسوا کی پذیرائی
مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے ان پاسبانوں سے
نہ لینے دی جنھوں نے فطرتِ شاعر کو انگڑائی
زمانہ کے نظامِ زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانینِ کہن آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے

(نظم "شکوۂ مختصر")

۱۹۴۰ء میں مجاز نے ایک غزل اور ایک نظم "گریز" کے علاوہ ایک نظم "حسن و عشق" کے عنوان سے مکالمہ کے انداز میں بھی کہی۔ لیکن ان تینوں میں نظم "گریز" کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس نظم میں انھوں نے بزمِ خوباں کے نام ایک پیغام دیا ہے۔ مجاز اس پیغام میں اپنے آپ کو حسن کا والی و شیدا نہیں بتاتے بلکہ جوانی اور محبت دونوں کو سرکش بتاتے ہیں اور اپنی تڑپ کو فطری تڑپ سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ اپنی نطق شعلہ فشاں کی قسم کھا کر یہ بھی کہتے ہیں کہ میں شاعر تو ہوں لیکن اب غزل خواں نہیں ہوں۔ مجاز کا غزل گوئی سے یہ انکار اور حسن سے یہ بے التفاتی ان کے ذوقِ غزل گوئی اور ذوقِ جمال کا درپردہ اقرار ہے۔ وہ حسن سے دور ہو کر خود حسن کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجاز اپنی تشنہ کامی اور تلخ کامی کے شدید احساس سے ایک گریز کا پہلو اختیار کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ حسبِ ذیل اشعار سے ظاہر ہے ۔۔۔

یہ جا کر کوئی بزم خوباں میں کہہ دو
کہ اب درخور بزم خوباں نہیں ہے
تڑپ میری فطرت تڑپتا ہوں لیکن
وہ زخمی پیکان مژگاں نہیں ہے
بایں تشنہ کامی بایں تلخ کامی
رہین لب شکر افشاں نہیں ہے

(نظم "کمریہ")

۱۹۴۱ء میں مجاز نے ایک نظم "ایک غمگین یاد" اور ایک غزل پر اکتفا کیا۔ وہ اپنی نظم "ایک غمگین یاد" میں اس ناکام محبت کا اظہار کرتے ہیں جس کو بھلانے کے باوجود بھلا نہیں سکتے بلکہ اس کو سینے سے لگائے رکھا ہے۔ ان کی وہ محبوب عورت جوان کے خیال وفکر میں بس گئی تھی اور جس کے لئے انھوں نے سماج اور مذہب سے جنگ کی تھی۔ وہی عورت کچھ دور ان کے ساتھ چل کر پھر اپنے حریم ناز میں واپس چلی جاتی ہے۔ مجاز بغیر کسی برہمی یا تلخی کا اظہار کئے اس کی محبت اور مہربانیوں کی رنگین یاد کو اپنی زندگی کا ایک اہم جز بنا لیتے ہیں۔ مجاز کی یہ اعلیٰ ظرفی اور معصومیت ان کو اردو کے دوسرے عشقیہ شاعروں سے بلند کر دیتی ہے۔ وہ محبوب کی بیوفائیوں کو طشت از بام کر کے اپنی محبت کی متاع عزیز کو برباد کرنا نہیں چاہتے۔ وہ محبوب کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں جیسا کہ ان کی نظم سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر نظم کے چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں ---

مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فرازِ آسماں پہ کہکشاں حسرت سے تکتی تھی
محبت جب چمک اٹھتی تھی اس کی چشم خنداں میں
خمستانِ فلک سے نور کی صہبا چھلکتی تھی

امنڈ آتے تھے جب اشکِ محبت اس کی پلکوں تک
ٹپکتی تھی در و دیوار سے شوخی تبسم کی
جب اس کے ہونٹ آجاتے تھے از خود میرے ہونٹوں تک
جھپک جاتی تھی آنکھیں آسماں پر ماہ و انجم کی
(نظم - ایک غمگین یاد)

مجاز کی اس دور کی غزل بھی ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی بھی عالم میں اپنی خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور نہ ان کے عزم میں کوئی لچک پیدا ہوتی ہے۔ جذبات کا ایک بہتا ہوا دریا ہے جو نظم و غزل دونوں میں یکساں طور پر موجیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ غزل کی صنف بہت پرانی ہے۔ مگر مجاز اس میدان میں بھی اپنی انفرادیت کا ایک روشن نقش قائم کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں

اذنِ خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم
ہٹ کر چلے ہیں رہگذرِ کارواں سے ہم

دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طراز شوق
لے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم

(غزل۔ "آسمان سے ہم")

۱۹۴۲ء میں مجاز نے صرف دو نظمیں "شہر نگار" اور "آہنگ نو" کہیں یہ دونوں نظمیں اپنے عنوان کے تحت ایک خاص انداز و مزاج رکھتی ہیں۔ مجاز کی نظم "شہر نگار" جس کا پہلا مصرع یہ ہے کہ

ع "رخصت اے ہم سفرو شہر نگار آہی گیا"۔

اس طرح مجاز کا ہم سفروں کو مخاطب کرنا "گورکی" اور دوسرے روسی ادیبوں کی یاد تازہ کرا دیتا ہے۔ جنھوں نے انقلاب سے پہلے "ہم سفروں کی تحریک" (Fellow Travellers) کے نام سے ایک تحریک چلائی تھی۔ اس نظم میں مجاز کی شہر نگاران سے والہانہ محبت اور جذبہ کی صداقت کے ساتھ کسی حد تک شاعرانہ تہذیب کی تکمیل کا بھی احساس ہوتا ہے۔ وہ جذبات کے اظہار کے لئے خوش آہنگ الفاظ کا ایک وافر خزانہ رکھتے تھے۔ نظم کا ہر مصرع گل و نسرین کی لطافت میں ڈوبا ہوا ہے۔ مجاز نے "شہر نگار" کو اپنے ان غزالوں کا جہاں بتایا ہے جن کے گیسوؤں اور کماندار ابروؤں کے وہ خود شکار ہو چکے تھے۔ نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

آج پھر تا بہ چمن در پئے گلہائے چمن
گنگناتا ہوا زنبور بہار آہی گیا

گیسوؤں والوں میں ابرو کے کمانداروں میں
ایک صید آہی گیا ایک شکار آہی گیا

خیر مقدم کو مرے کوئی بہ ہنگام سحر
اپنی آنکھوں میں لئے شب کا خمار آہی گیا

(نظم "شہر نگار")

"آہنگ نو" میں مجاز جوانان وطن کو وطن کی بربادی و تباہی کا احساس دلاتے ہیں۔ اور ان کی غیرت و حمیت کو ابھار کر وطن کی فلاح و بہبودی کی ترغیب دیتے ہیں۔ ایک سچے وطن پرست کی طرح مجاز کو اپنے وطن کا ہر گوشہ عزیز ہے۔ وہ شہر در شہر دشمنوں کے شبخون مارنے کی تیاری دیکھتے ہیں تو گاؤں اور دیہاتوں پہ بم باری کی خبریں بھی سنتے ہیں۔ وہ جوانان وطن کو "خالد" اور "بھیم" جیسے جری اور بہادر لوگوں کی اولاد بتاتے ہیں۔ اور دشمنوں سے مقابلہ کر کے ان پر فتح و نصرت حاصل کرنے کے لئے ان کی ہمت افزائی بھی کرتے ہیں۔ وہ جوانوں سے کہتے ہیں کہ تم تنہا نہیں ہو بلکہ تمہارے دمسازوں میں روس اور چین کے جانباز بھی ہیں اور مجاز جیسا زمزمہ پرداز بھی ہے۔ اس لئے اے جوانو بڑھو اور انسانوں کے سر سے اس تازہ مصیبت کو دور کر دو کیونکہ تم جوان ہو اور خون میں حرارت رکھتے ہو اس لئے تم اس سماجی دوزخ کو جنت بنا سکتے ہو۔ مجاز کی یہ پوری نظم انقلابی شان سے معمور ہے۔ نظم کے چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

یہ تو ہیں فتنۂ بیدار دبا دو ان کو
یہ مٹا دیں گے تمدن کو مٹا دو ان کو
پھونک دو ان کو جھلس دو کہ جلا دو ان کو
شان شایان وطن ہو یہ بتا دو ان کو

یاد ہے تم کو کن اسلاف کی تم یادیں ہو
تم تو خالد کے پسر بھیم کی اولادیں ہو

تم تو تنہا بھی نہیں ہو کئی دمساز بھی ہیں
روس کے مرد بھی ہیں چین کے جانباز بھی ہیں
کچھ نہ کچھ ساتھ فرنگی فسوں ساز بھی ہیں
اور ہم جیسے بہت زمزمہ پرداز بھی ہیں

دور انسان کے سر سے یہ مصیبت کر دو
آگ دوزخ کی بجھا دو اسے جنت کر دو

(نظم۔ "آہنگ نو")

۱۹۴۳ء کے اختتام تک مجاز کا سرمایۂ شاعری ایک غزل اور ایک نظم "عشرت تنہائی" ہے۔ مجاز محبت اور حسن کے شاعر تھے۔ انھیں کلیساؤں کے آہو اور غزالان حرم سے ایک خاص نسبت تھی۔ وہ خود مسکرانے کے عادی تھے اور ہر شے کو تبسم دیکھنے کے خواہش مند۔ وہ وفاپرست تھے اور ایک مخلص با وفا کی طرح اپنے چاک گریباں سے بے نیاز ہر آنکھ میں بادۂ عیش و فراغت کا سرور اور ہر جسم پر اطلس و کمخواب دیکھنے کی ایک نیک خواہش رکھتے تھے جیسا کہ خود ان کے کلام سے ظاہر ہے۔

میں کہ میخانۂ الفت کا پرانا میخوار
محفل حسن کا اک شیریں گفتار
ماہ پاروں کا ہدف زہرہ جبینوں کا شکار
نغمہ پیرا و نوا سنج و غزلخواں ہوں میں

اب یہ ارمان کہ بدل جائے جہاں کا دستور
ایک اک آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور
ایک اک جسم پہ ہو اطلس و کمخواب و سمور
اب یہ بات اور ہے خود چاک گریباں ہوں میں

(نظم "عشرت تنہائی")

۱۹۴۴ء میں مجازؔ نے ایک غزل اور تین نظمیں "عیادت" "مادام" اور "آج بھی ہے" کہیں۔ ان میں "عیادت" اور "مادام" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مجازؔ کی ان دونوں نظموں میں ان کی محبوب عورت جس کا تصور ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ اور جس کے انفاس کی مہک اور رعنائی جمال سے ان کی فکر شعر نے کیف و سرور نور و نکہت حسن پرور معصومیت اور روح پرور تب و تاب کے بے بہا خزانے حاصل کئے۔ اسی عورت کی شخصیت اور کردار و مزاج کے مختلف پرکشش اور دلنواز پہلو ہفت رنگ نگینوں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں۔ "عیادت" کی ہیروئن کا شباب نفس مسیح کا کام کرتا ہے تو "مادام" کی عورت حسن زلیخائی سے معمور ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے جوشؔ اور مجازؔ کی ان نظموں پر جو عورت سے متعلق ہیں اس طرح اظہار خیال کیا ہے کہ "جوشؔ کا رویہ عورت کے ساتھ خالص جاگیردارانہ ہے۔ یعنی اپنی بہو بیٹیوں پر تو وہ قدغن لگاتے ہیں۔ اور انھیں خاتون مشرق بننے کی تلقین کرتے ہیں لیکن مہترانی اور جامن والیاں ان کی ہوس کا آلہ کار بنتی ہیں۔ اس کے برخلاف مجازؔ کا نقطہ نظر جدید اور ایک صحت مند رومانی کا نقطہ نظر ہے نیز عورت کے متعلق ان کا شعور

ایک بیدار اور صالح شعور ہے۔" ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے اس خیال کی تائید مجاز کی بیشتر نظموں سے ہوتی ہے۔ مجاز کی نظموں کے چند مختلف شعر ملاحظہ ہوں۔

بیمار کے قریب بصد شان احتیاط
دلداریٔ نسیم بہاراں لئے ہوئے
رخسار پہ لطیف سی اک موج سرخوشی
لب پہ ہنسی کا نرم سا طوفاں لئے ہوئے
پیشانیٔ جمیل پہ انوارِ تمکنت
تابندگیٔ صبح درخشاں لئے ہوئے
اک اک ادا میں سیکڑوں پہلوئے دلدہی
اک اک نظر میں پرسشِ پنہاں لئے ہوئے

(نظم۔"عیادت")

زلف کی چھاؤں میں عارض کی تب و تاب لئے
لب پہ افسوں لئے آنکھوں میں مے ناب لئے
نشۂ ناز جوانی میں سراپا اور ادا
جسم ذوق گہر و اطلس و کمخواب لئے
لب گلرنگ و حسیں جسم گداز و سیمیں
شوخیٔ برق لئے لرزشِ سیماب لئے
ایک صیاد خوش اندام سواد مشرق
زلف بنگال لئے طلعت پنجاب لئے

نزہت و ناز کا اک پیکرِ شاداب و حسیں
نکہت و نور کا اُمڈا ہوا سیلاب لئے

(نظم "بادام")

۱۹۴۵ء میں مجاز نے پانچ غزلیں اور آٹھ نظمیں کہیں جن میں ان کا مشہور گیت "بول اری او دھرتی بول" بھی شامل ہے۔ مجاز کی پختگی اور انداز بیان کی فنکارانہ انفرادیت نے ان کی نظموں اور غزلوں کو ایک ہی رنگ دے دیا ہے دونوں ایک ہی شخص کی کہی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور دونوں میں ایک ہی جذبہ اور ایک ہی تاثر کارفرما ہے۔ ایک ہی سورج کی دو یکساں کرنیں دونوں اصناف شاعری یعنی نظم و غزل سے پھوٹتی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں وہی لب و لہجہ ہے جو ان کی نظموں میں ملتا ہے۔ مجاز نے اگرچہ غزلیں کم کہی ہیں مگر تعداد میں کم ہونے کے باوجود بھی انھوں نے غزل کے میدان میں ایک خاص کیفیت پیدا کی ہے اور نئے غزل گو شعراء کے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ اس دور کی غزلوں کے چند مختلف اشعار ملاحظہ ہوں۔

کچھ نہ پوچھ اے ہمدم ان دنوں ہمارا عالم
مطرب حسین اپنا ساقیٔ جوان اپنا
آہ بے اثر کس کی نالۂ نارسا کس کا
کام بارہا آیا جذبۂ نہاں اپنا

(غزل "جہاں اپنا")

میری دنیا جگمگا اٹھی کسی کے نور سے
میرے گردوں پر مرا ماہِ تمام آ ہی گیا
جھوم جھوم اٹھے شجر کلیوں نے آنکھیں کھول دیں
جانبِ گلشن کوئی مستِ خرام آ ہی گیا
زندگی کے خاکۂ سادہ کو رنگیں کر دیا
حسن کام آئے نہ آئے عشق کام آ ہی گیا

(غزل۔ "آ ہی گیا")

میری نظروں میں حشر بھی کیا ہے
میں نے اُن کا جلال دیکھا ہے
جب بھی آنکھیں ملیں ان آنکھوں سے
دل نے دل کا مزاج پوچھا ہے
سچ تو یہ ہے مجاز کی دنیا
حسن اور عشق کے سوا کیا ہے۔

(غزل۔ "نالۂ بیباک پہونچا ہے")

مجاز کی اس دور کی نظموں میں "مجھے جانا ہے اک دن" اور "اعتراف" خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ مجاز کی نظم "مجھے جانا ہے اک دن" ایک گہرے اور اس حقیقی جذبہ کی ترجمان ہے جو سماج کے قوانین فرسودہ کے جمود انسانیت کی پامالی اور فاقہ کش انسانوں کی مضمحل آنکھیں اور جھلسے ہوئے چہروں کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ مجاز نے جس بات کو محسوس کیا ہے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے اور بڑے خلوص اور دردمندانہ طریقہ سے پیش کر دیا ہے۔ ۵۵

جب اپنے محبوب کو سماجی قید و بند میں مجبور اور بے بس دیکھتے ہیں
تو اس طرح کہہ اٹھتے ہیں کہ

ابھی تو حسن کے پیروں پہ ہے جبرِ حنابندی
ابھی ہے عشق پر آئینِ فرسودہ کی پابندی
ابھی حاوی ہے عقل و روح پر جھوٹی خداوندی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

(نظم۔ "مجھے جانا ہے اکدن")

مجاز جب انسانیت کو دولت کا مقتکار دیکھتے ہیں اور فاقہ کش
انسانوں پر جب ان کی نظر پڑتی ہے تو ان کی روح تڑپ اٹھتی ہے
اور وہ سماجی اصلاح کے لئے محبوب کی بزمِ ناز چھوڑنے کے لئے
تیار ہو جاتے ہیں ---

ابھی تہذیب عدل و حق کی کشتی کھے نہیں سکتی
ابھی یہ زندگی دادِ صداقت دے نہیں سکتی
ابھی انسانیت دولت سے ٹکرّ لے نہیں سکتی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو فاقہ کش انسان سے آنکھیں چرانا ہے
ابھی جھلسے ہوئے چہروں پہ اشکِ خوں بہانا ہے
ابھی پامال جور آدم کو سینے سے لگانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

(نظم۔ "مجھے جانا ہے اکدن")

مجاز کی نظم "اعتراف" ان کی آخری بڑی نظم ہے۔ جو عورت مجاز کے

ذہن و فکر پر چھا گئی تھی جس کی محبت اور پرستش ان کی فکر شعر کا نقطۂ آغاز بن گئی تھی اور جس کے کھو جانے کے غم نے ان کی زندگی اور شخصیت کی ہر دلکشی چھین لی تھی وہی عورت ایک بار پھر مجاز کے سامنے آتی ہے مگر اس وقت جبکہ وہ شوق طلب اور وصل سے لذت اٹھانے کی منزل سے گزر چکے ہوتے ہیں۔ جب زندگی کے نشے میں جھومنے والا مجاز زندگی کی رنگینیوں سے کوسوں دور ہو جاتا ہے ان کی محبت کا وہ سرسبز درخت جس کے سائے میں انھوں نے ماضی کے حسین خواب دیکھے تھے خزاں کی نذر ہو چکتا ہے۔ مجاز کی یہ نظم ان کی دلی کیفیات کا ایک ایسا دردانگیز اظہار ہے جس کی مثال ہماری اردو شاعری میں کمیاب ہے۔ شدت احساس اور بے پناہ تاثیر نے اس نظم کو اک لازوال شاہکار بنا دیا ہے۔ نظم کے چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو
میں نے مانا کہ تم اک پیکر رعنائی ہو
چمن دہر میں روح چمن آرائی ہو
طلعت مہر ہو فردوس کی برنائی ہو
تجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریاد جگر دوز مرا نالۂ زار

شاعری

شدتِ کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار
وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

(نظم: "اعتراف")

بقول مجتبیٰ حسین "آوارہ" سے جس دور کا آغاز ہوتا ہے "اعتراف" اس دور کا اختتام ہے ۔۔۔ یہ نظم صرف مجاز کی ذاتی شکست نہیں پورے دور کی شکست کی آواز ہے"۔

۱۹۴۶ء میں مجاز نے صرف ایک نظم "بتانِ حرم" کے عنوان سے کہی۔ مجاز کی یہ نظم بھی ان کی دوسری نظموں کی طرح لطیف جذبات اور نادر تشبیہات اور استعارات کا ایک دلکش مرقع ہے۔ وہ اپنے جذبے کی پوری گرمی کو شعر میں حل کر دیتے ہیں اسی وجہ سے ان کے کلام میں صداقت ترنم گھلاوٹ اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ برجستہ صفائی کے ساتھ پر اثر انداز میں اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ ان کی قوتِ احساس آنچلوں کی سرسراہٹ سے زمزموں کی کیفیت محسوس کر لیتی ہے اور گداز جسموں کے پیراہن سے انہیں نکہتِ خلد کی مہک محسوس ہوتی ہے۔ وہ حسن کے ایک ایک عضو پر بڑی گہری اور فنکارانہ نظر ڈالتے ہیں جیسا کہ ان کی اس نظم کے مختلف اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

نرم صوفے گود میں فردوسِ رعنائی لئے
زلف کے خم مرمریں شانوں کی برنائی لئے

وہ سبک چاندی سے پیکر وہ جوانی کا نکھار
آذرِ فطرت کی صناعی کے زندہ شاہکار
رخ پہ شادابی لبوں میں رس تبسم برق پاش
چست پیراہن نمایاں جسم سیمیں کی تراش
آنچلوں کی سرسراہٹ زمزمے گاتی ہوئی
پیرہن سے نکہت خلدِ بریں آتی ہوئی
وہ لچک سی جسم نازک میں خود اپنے بار سے
پھوٹ نکلیں تھیں شعاعیں عارض و رخسار سے
وہ سمٹنے کی ادا طوفان رعنائی کے ساتھ
ذوق خود بینی مذاقِ بزم آرائی کے ساتھ

(نظم "بتانِ حرم")

مجاز نے خوبصورت اور خوش آہنگ الفاظ کے استعمال سے پوری نظم کو ایک پھولوں کا گلدستہ بنا دیا ہے۔ یہ نظم ان کے مشاہدہ حسن کی ایک کامیاب اور واضح تصویر ہے۔

۱۹۴۷ء میں مجاز نے ایک نظم "پہلا جشن آزادی" کے عنوان سے لکھی۔ اس نظم میں وطن کی آزادی کی ایک بے پناہ مسرت کارفرما ہے۔ وہ اس طوق غلامی کے کٹ جانے پر بے حد مسرور ہیں جو ایک عرصہ دراز سے ان کے وطن کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ مجاز وطن کے آزاد ہو جانے کے بعد اہل وطن کو مسرور و شادماں دیکھتے ہیں اور انھیں اس خوشی سے لطف اندوز ہونے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ وہ صرف وطن کے آزاد ہو جانے پر ہی قناعت نہیں کرتے بلکہ

وطن کے اندرونِ خانہ تمام بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور جب تک وطن تمام حالات سے درست نہیں ہوتا وہ وطن کی آزادی کو ایک نامکمل آزادی تصور کرتے ہیں۔ اسی لیئے وہ کہتے ہیں کہ

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں
یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں
ابھی وہ سعئی جنوں خیز کامیاب نہیں

یہ انتہا نہیں آغاز کار مرداں ہے

مجاز کی دنیائے شاعری میں حسن و عشق کے ترم طوفان ہر جگہ موجیں مارتے نظر آتے ہیں وہ جب سیاسی میدان میں اترتے ہیں تو وہاں بھی ان کے لہجہ میں کرختگی پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ انقلاب کے مغنی بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی نغمگی کہیں ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی اسی لیئے فیض احمد فیض نے مجاز کے مجموعۂ کلام "آہنگ" کے دیباچہ میں مجاز کو انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب کہا ہے"۔

۱۹۴۸ء میں مجاز نے صرف ایک غزل پر اکتفا کیا ہے۔ اس غزل میں ان کا رجحان سیاسی ہو گیا ہے۔ وہ آزادی کے بعد پیدا ہونے والے حالات سے کافی حد تک متاثر نظر آتے ہیں۔ مجاز وطن پرست اور حساس طبیعت شاعر تھے وہ کیونکر بگڑے ہوئے حالات سے متاثر نہ ہوتے۔ ان کی قوت احساس نے ہر بات کو محسوس کیا ہے اسی لیئے تو انہیں کہنا پڑا کہ

وہاں کتنوں کو تخت و تاج کا ارمان ہے کیا کہئے
جہاں سائل کو اکثر کاسۂ سائل نہیں ملتا
یہ قتلِ عام اور بے اذن قتلِ عام کیا کہئے
یہ بسمل کیسے بسمل ہیں جنہیں قاتل نہیں ملتا

(غزل۔ "کامل نہیں ملتا")

۱۹۴۹ء میں غزالانِ حرم اور نگارانِ لکھنؤ کا شاعر قریب قریب۔ بالکل خاموش رہا۔ اس پورے طویل عرصہ میں مجاز کے نغمہ بار ساز سے کوئی نغمہ نہ پھوٹ سکا۔ ۱۹۳۶ء میں مجاز نے اپنی جس مجبوری کی طرف اشارہ کیا تھا وہ ۱۹۴۹ء میں عملی صورت میں ظاہر ہو گئی یعنی

کوئی نغمے تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے
جو گانا چاہتا ہوں آہ وہ میں گا نہیں سکتا

۱۹۵۰ء میں مجاز نے دو غزلیں اور تین نظمیں "وطن آشوب" "فکر" اور "سانحہ" (گاندھی جی کی موت سے متاثر ہو کر) کہیں غزلوں میں مجاز کی وہ محبوب غزل بھی شامل ہے جس کو انہوں نے اپنی موت سے دو دن قبل تک بڑے انداز سے پڑھا تھا۔ اس غزل میں مجاز کی خود اعتمادی اور خود داری کی ایک نمایاں تصویر جھلکتی ہے۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ـــ

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا — تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
ابھی بزمِ طرب سے کیا اٹھوں میں — ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے
بہ ایں سیلِ غم و سیلِ حوادث — مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مجاز اک بادہ کش تو ہے یقیناً
جو ہم سنتے تھے وہ عالم نہیں ہے

اس دور کی نظموں میں مجاز کی نظم "فکر" کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے مجاز کی اس نظم پر اظہار خیال کیا ہے کہ "یہ مجاز کی آخری اہم نظم ہے جسے ان کی شخصیت اور شاعری فکر اور فن کا نقطۂ عروج کہہ سکتے ہیں۔" اس نظم میں مجاز نے سماجی کشمکش اور اپنے ذہنی کرب کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا ہے مجاز زندگی بھر حادثات سے مسکراتے ہوئے گزرتے رہے۔ ان کے ہونٹوں پر بظاہر تبسم کی موجیں کھیلتی رہیں لیکن ان کا دل جلتا رہا ان کے سینے میں شعلے بھڑکتے رہے۔ مجاز کی اس پوری نظم میں ان کی نا آسودگی حسرت و ارمان کی پامالی اک تازہ جنون تعمیر اور حسین خوابوں کی جھلک اک جداگانہ انداز میں دیکھی جاسکتی ہے یہ نظم ان کی ہمہ گیر شخصیت، فنکارانہ صلاحیت اور ان کی انفرادیت کے واضح اور روشن نقوش رکھتی ہے۔ مجاز کی یہ نظم ابتدا ہی سے ان کی ذہنی پرواز ان کی حوصلہ مندی اور ان کے شوق کی شوریدہ سری کا صاف پتہ دیتی ہے۔ مجاز نے اپنی گذری ہوئی زندگی کے ہر پہلو کو بڑے غور سے دیکھا ہے انہوں نے اپنی بربادی پر بھی نظر کی ہے مگر ان کی حوصلہ مندی انہیں تازہ دم بنا دیتی ہے اور وہ اک نئے جنون تعمیر کو لے کر اٹھتے ہیں۔ لیکن جب ان کو "دشت ظلمات" سے گزرنے کا خیال آتا ہے تو اک بازوئے سیمیں کے سہارے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔ جس کو وہ

عالمِ تیرگی میں اک تابندہ سہارے سے تعبیر کرتے ہیں۔ نظم کے چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

مٹ کے برباد جہاں ہو کے کبھی کچھ کھو کے
بات کیا ہے کہ زیاں کا کوئی احساس نہیں
کار فرما ہے کوئی تازہ جنونِ تعمیر
دل مضطر ابھی آ ماجگہ یاس نہیں

تازہ دم بھی ہوں مگر پھر یہ تقاضا کیوں ہے
ہاتھ رکھ دے مرے ماتھے پہ کوئی زہرہ جبیں
ایک آغوشِ حسیں شوق کی معراج ہے کیا
کیا یہی ہے اثرِ نالہ دلہائے حزیں

میں نے سوچا تھا کہ دشوار ہے منزل اپنی
اک حسیں بازوئے سیمیں کا سہارا بھی تو ہو
دشتِ ظلمات سے آخر کو گزرنا ہے مجھے
کوئی رخشندہ و تابندہ ستارا بھی تو ہو

بہ ایں انعام وفا اف یہ تقاضائے حیات
زندگی وقفِ غمِ خاک نشیناں کر دے
خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خونِ دل نذرِ چمن بندیٔ دوراں کر دے

شاعری

مجاز پامال محبت ہو کر بھی کارزار حیات ہیں کفن بردوش ہو کر اپنے خون کے آخری قطروں کو چمن بندی میں صرف کرنا چاہتے ہیں اور ان کی یہ خواہش انھیں جنسی اور نفسیاتی حدود سے الگ ایک اہم مقام پر متعین کر دیتی ہے۔

۱۹۵۱ء میں مجاز نے اپنے سرمایۂ شاعری میں ایک غزل اور ایک نظم "خراج عقیدت" کا اضافہ کیا۔ اب ان کے مزاج میں وہ شوخی اور جذبہ میں وہ بھرپور گرمی نہیں محسوس ہوتی جو ان کا ایک نمایاں وصف رہی تھی پھر بھی ان کے اس دور کے کلام میں کوئی جھول اور ڈھیلاپن نہیں محسوس ہوتا۔ الفاظ پر فنکارانہ قدرت اور ایک طویل شعر گوئی کی مشق نے ان کو ہر قدم پر سہارا دیا ہے۔

۱۹۵۲ء میں مجاز نے ایک مختصر نظم "زہراب حسن" کے عنوان سے اور دو غزلیں کہیں۔ ان کے بعد انھوں نے اپنے کلام میں ایک غزل کا اور مزید اضافہ کیا۔ مجاز نے نظموں اور غزلوں کے علاوہ کچھ قطعات بھی کہے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی ابتدا غزل سے ہوئی اور درمیان کے ایک خاصے وقفہ میں انھوں نے بڑی کامیاب نظمیں بھی کہیں لیکن ان کی شاعری کا اختتام غزل پر ہی ہوا۔ مجاز ترقی پسند شاعر ہونے کے باوجود شاعری کی پرانی صنف "غزل" کے خلاف نہیں رہے۔ انھوں نے ماضی کے پرانے سرمایہ کو بھی سینے سے لگائے رکھا اور نئی روشنی پر بھی گامزن رہے۔ مجاز کی نظموں اور غزلوں کے کافی حوالے دئے جا چکے ہیں۔ اب ان کے مختلف قطعات بھی ملاحظہ ہوں۔

HaSnain Sialvi

محرم سر تابش حسن جواں ہو جائیے
گلفشانی تا کجا شعلہ فشاں ہو جائیے
کھائیے گا اک نگاہ لطف کا کب تک فریب
کوئی افسانہ بنا کر بد گماں ہو جائیے

کفر کیا تثلیث کیا الحاد کیا اسلام کیا
تو بہر صورت کسی زنجیر میں جکڑا ہوا
توڑ سکتا ہو تو پہلے توڑ دے سب قید و بند
بیڑیوں کے ساز پر نغمات آزادی نہ گا

وقت کی سعی مسلسل کارگر ہوتی گئی
زندگی لحظہ بہ لحظہ مختصر ہوتی گئی
ساز کے پردوں میں بجتا ہی رہا ساز حیات
موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہوتی گئی

دل کو محو غم دلدار کئے بیٹھے ہیں
رند بنتے ہیں مگر زہر پیئے بیٹھے ہیں
چاہتے ہیں کہ ہر اک ذرہ شگوفہ بن جائے
اور خود دل ہی میں اک خار لئے بیٹھے ہیں

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

مجاز

یہ مانا آج دل فرطِ الم سے پارا پارا ہے
بلندی دیکھنے والے کو پستی بھی گوارا ہے
ہزاروں کے لئے میں گر چکا ہوں بام گردوں سے
ہزاروں وہ ہیں جن کو میں نے گردوں سے اتارا ہے

مجازؔ کی نظموں اور غزلوں کی طرح ان کے قطعات میں بھی ان کی اپنی انفرادیت نمایاں ہے۔ اگرچہ قطعات مجازؔ نے بہت کم کہے ہیں لیکن جس قدر بھی کہے ہیں ان میں مجازؔ کی آواز اپنی ممتاز خصوصیت رکھتی ہے۔

اب مجازؔ کے غیر مطبوعہ کلام کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو ان کے ایام جنوں کی یادگار بتایا جاتا ہے۔ مجازؔ کا یہ غیر مطبوعہ کلام ڈاکٹر محمد حسن کی ڈائری "گل نغمہ" سے نقل کیا گیا ہے جو "نقوش" مارچ ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔

مجازؔ کا غیر مطبوعہ کلام

(ایام جنوں کی غزلیں جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہیں)

جذبۂ شوق نہیں شہپر پرواز نہیں — للہ الحمد کہ وہ یار کچھ ناز نہیں
حسن کی بزم بھی خلوت کدۂ ناز نہیں — عالم عشق کوئی انجمن راز نہیں

(یہ شعر کاٹ دیا گیا ہے)

وعدۂ لیل نہیں بادۂ گلفام تو ہے — لب شکر ریز نہ ہوں آنکھ بھی غماز نہیں
نالۂ درد نہیں رونق محمل تو نہ ہو — یہ کوئی نجد کی بکھری ہوئی آواز نہیں
سنگ ساری ہے کہ لوہا بھی پگھل جائے مجازؔ — لب فریاد پہ بجلی کوئی اعجاز نہیں

یہ تیرگیٔ شب ہی کچھ صبح طراز آئی
خود وعدۂ فردا کی چھاتی بھی دھڑک جاتی
ہونٹوں پہ ہنسی پیہم آتے ہوئے شرماتی } (ایک جگہ اس طرح
کیا صبح قیامت ہی حاصل ہے جدائی کا } لکھا ہے)
اب رات نہیں کٹتی اب نیند نہیں آتی
جو اوّل و آخر تھا وہ اوّل و آخر ہے
میں نالہ بجاں اٹھتا وہ نغمہ لبساز آتی
سوزِ شبِ ہجراں پھر سوزِ شبِ ہجراں ہے
شبنم بہ مژہ اٹھتی یا زلف دراز آتی
یارب وہ جوانی بھی کیا محشرِ ارماں تھی
انگڑائی بھی جب لیتی ایک آنکھ جھپک جاتی
آغاز سیہ مستی انجام سیہ مستی
آئینہ میں صورت بھی آنے کی قسم کھاتی
سینے میں مجازؔ اب تک وہ جذبۂ کافر تھا
تثلیث کی جو ننده وحدت کی قسم کھاتی

نہ رہ نما نہ کسی رہگذر کو دیکھتے ہیں
جدھر سے تیر چلے ہیں ادھر کو دیکھتے ہیں
جبینِ گرم بہ تمکینِ ناز کیا کہیے
ابھی فریبِ قضا و قدر کو دیکھتے ہیں
نگاہ آئنہ نے معصیت پناہی کی

نگاہ ہو گی کبھی معصیت پناہی پر سے (ایک مصرعہ یہ بھی لکھا تھا)

ابھی تو وسعت دامان تر کو دیکھتے ہیں
سواد نجد کی رعنائیوں میں گم یکسر
کسی سفیر کے عزم سفر کو دیکھتے ہیں

زلف سرکش بے نیاز پیچ و خم — قیس کے چاک گریباں کی قسم

آبنوسی جسم پر تانبے کا رنگ — قلب شاعر کو نوید عزم جنگ

زلزلے ہیں طالع بیدار میں — وہ توانائی لب و رخسار میں

عارض گلرنگ پیمانے لئے — انکھڑیاں راتوں کے افسانے لئے

(سودا کی زمین میں غزل کہی ہے)

رعشہ سا جویان دست و گریبان میں دیکھا
ہندو میں نہ پایا نہ مسلمان میں دیکھا
سفاک سے ابرو یہ غضبناک سی آنکھیں
اک داغ سا ہر قلب پر ارمان میں دیکھا
فرخندہ جبین ہو کے کبھی شمشیر بکف ہے
شیطان نے کیا سینۂ انسان میں دیکھا
اب درد کلیجے سے لگائے ہوئے پھرتے
ایمان سے پایا ہے نہ ایمان میں دیکھا

شاعری

اس سے تو مجازؔ آپ بھی بے بہرہ ہوں شاید
جو سوز وفا آپ کے ہذیان میں دیکھا

("نقوش" لاہور مارچ ۵۶ ۱۹ء)

مجاز دراصل نوجوانوں کے شاعر تھے۔ انھوں نے نوجوانوں کے جذبات احساسات اور تجربات کی اپنے مخصوص انداز میں نمائندگی کی ہے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیت فنکارانہ قدرت جذبے کی گرمی معنی خیز الفاظ کی دروبست نادر تشبیہات و استعارات فکر کی پرواز تخیل کی رنگینی اور مشاہدہ کی گہرائی نے اردو شاعری کو نئی کیفیتیں دیں اور یہی مجاز کا وہ کمال ہے جو ان کو اپنے ہمعصروں میں ممتاز اور نمایاں کرتا ہے۔ مجاز جن واقعات سے دوچار ہوتے ہیں اور زندگی کے جن پہلوؤں پر ان کی نظر گئی ہے انھوں نے ان واقعات اور ان پہلوؤں کی بڑی بھرپور اور کامیاب عکاسی کی ہے۔ مجاز کی غنائی شاعری کے بارے میں اختر انصاری لکھتے ہیں "دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مجاز کی یہ رعنائی اور جذباتی شاعری کوئی سطحی اور ادنیٰ قسم کی عشقیہ شاعری نہ تھی۔ چنانچہ اس میں جذبات نگاری تو ہے مگر سستی جذبہ فروشی یا مریضانہ جذباتیت نہیں ہے۔ وہ ایک تندرست اور صالح حسن پرستی کا ثبوت ضرور دیتی ہے لیکن رکیک عشق بازی اور بیمارانہ لذت پسندی کے اثرات سے بالکل پاک ہے۔" اور مجاز کی ترقی پسندانہ نظموں کے مطابق اختر انصاری کا کہنا ہے "وہ ایک ایسے شاعر کی تخلیقات معلوم ہوتی ہیں جس کا اجتماعی احساس اور نظریاتی شعور اچھی طرح ترقی پا چکا ہے اور جو اپنی شاعری کو ایک مخصوص تصویر حیات کے تابع کر چکا ہے لیکن اس کے باوجود فن کے مطالبات کو کسی قیمت پر نظر انداز کرنے کے لئے تیار نہیں۔"

شاعری

مجاز کی دنیا حسن و عشق کی دنیا تھی اور جیسا کہ اس سے پہلے کہا جا چکا ہے کہ وہ ابتدا سے آخر تک غنائی شاعر رہے۔ لیکن ان کے دل میں عوام کا درد بھی تھا وہ بنی نوع انسان سے بے لاگ محبت رکھتے تھے۔ انہوں نے سماج کے فرسودہ نظام پر گہری تنقیدی نظریں بھی ڈالی ہیں اور اس کے بدلنے کی بڑی حد تک کوشش بھی کی ہے وہ پرانے رسم و قید کی مستحکم عمارت کو ڈھانے کی کوشش میں بھی اپنے کردار و گفتار سے شریک رہے۔ انہوں نے مذہب کے جھوٹے دعویداروں کے چہروں کو بے نقاب کرنے کی بھی کوشش کی۔

مجاز نے محبت بھی بڑے سلیقے سے کی ہے انہوں نے اپنی بربادی کے باوجود محبت کے وقار کو صدمہ نہیں پہونچنے دیا۔ مجاز نے جو چراغ اپنے خونِ دل سے روشن کیا تھا اس کی وہ آخر دم تک حفاظت کرتے رہے اور دنیا ان کے جلائے ہوئے چراغ سے روشنی حاصل کرتی رہی۔ مگر جو چراغ انہوں نے جلایا وہ ان کی اپنی زندگی کو روشنی نہ دے سکا۔

مجاز نے اردو شاعری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا ہے۔ انہوں نے اگرچہ تمام عمر آگ کو گھول کر پیا اور اپنے سارے جسم کو بادہ گلگوں کے شعلوں کی نذر کر دیا لیکن بقول ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے ذہن کو نفسیاتی پیچیدگیوں اور مریضانہ رجحان سے محفوظ رکھا۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اسے تمام رومانی شعراء میں ممتاز کرتی ہے جس کا اعتراف ہر صاحب ذوق نقاد کرے گا۔"

مجاز شعر گوئی کے علاوہ بعض ایسی خوبیوں کے بھی مالک تھے جو دوسرے اردو شاعروں کو بہت کم نصیب ہوئی ہیں۔ ان کا ایک خاص وصف برمحل فقرہ تراشی اور لطیفہ گوئی بھی تھا۔ یہ ان کی ایک ایسی خوبی تھی جو ان کی مقبولیت میں ان کی شاعری کے ساتھ برابر کا دخل رکھتی ہے۔ ان کے لطیفوں اور چٹکلوں کا تذکرہ سارے ملک کے تعلیم یافتہ حلقوں میں برابر ہوتا رہا ہے۔ ان کے لطیفے اتنے بے ساختہ اور برجستہ ہوتے تھے کہ خوش مذاق لوگوں کی زبانی غالب کی باتوں کی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچتے تھے۔ مجاز کے لطیفوں نے نہ تو کبھی کسی کی دل آزاری کی اور نہ کبھی تہذیب کے دائرہ سے باہر ہوئے۔ ان کی شاعری کی طرح ان کے لطیفے بھی معصوم تخلیق کا حکم رکھتے ہیں۔ مجاز کا یہ وصف ان کے ذہین اور خوش مذاق ہونے کا بعین ثبوت ہے۔ مثال کے طور پر یہاں مجاز کے کچھ لطیفے پیش کئے جاتے ہیں۔

مجاز کے لطیفے

جوش ملیح آبادی فراق گورکھپوری اور مجاز ایک رات تینوں کہیں ہم پیالہ تھے۔ جوش نے تیسرا پیگ پینے کے بعد اپنے مخصوص افغانی جلال میں آتے ہوئے کہا۔۔۔

ماشاء اللہ ہم ابھی تک جوان ہیں۔ ہماری عمر پچیس تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ کیوں فراق۔۔۔

"بے شک۔ بے شک" فراق نے پر زور تائید کرتے ہوئے کہا "ظاہری شباہت سے قطع نظر میں بھی اٹھارہ بیس سال سے زیادہ عمر کا نہیں ہوں"۔

"جی ہاں ۔۔۔۔ جی ہاں" جوش نے مسکراتی ہوئی نظروں سے فراق کے پوپلے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"۔۔۔ اور اس حساب سے ۔۔۔۔ مجاز نہایت معصومیت سے جوش اور فراق کو متوجہ کرتے ہوئے بولا۔۔۔" اور اس حساب سے ہم تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے۔"

۔۔۔ جوش ملیح آبادی بالعموم شراب پیتے وقت ٹائم پیس سامنے رکھ لیتے ہیں اور ہر پندرہ منٹ کے بعد نیا پیگ لیتے ہیں۔ مگر یہ پابندی بھی اکثر اوقات تیسرے چوتھے پیگ کے بعد "نذر جام" ہوجاتی ہے۔

ایک صحبت میں انہوں نے پہلا پیگ حلق میں انڈیلنے کے بعد اپنے ٹائم پیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجاز سے کہا

"دیکھو مجاز میں کتنی باقاعدگی سے شراب پیتا ہوں۔ اگر تم بھی گھڑی سامنے رکھ کر شراب پیو تو بے احتیاطی سے محفوظ رہو۔"

اور مجاز اسی وقت چہکتے ہوئے بولا۔ "گھڑی تو کیا جوش صاحب میرا بس چلے تو گھڑا سامنے رکھ کر پیا کروں۔"

—— فراق گورکھپوری اپنی رباعیات کا دوسرے شاعروں کی رباعیوں سے موازنہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے ——

"کہنے کو تو رباعیاں جوش صاحب بھی کہتے ہیں لیکن وہ اس صنعت سخن کا باقاعدہ فن کی حیثیت سے استعمال نہیں کرتے۔ دراصل وہ اپنی شاعری کے منہ کا مزا بدلنے کے لئے دوسری چیزیں لکھتے لکھتے کبھی کبھی رباعیاں بھی لکھ دیتے ہیں۔ ان کی رباعیات ایک طرح سے "چٹنی" ہیں اور میری رباعیاں ——"

مجاز نے فراق کی بات کاٹتے ہوئے کہا

"ایک طرح سے مربّہ"

—— جوش ملیح آبادی نے مجاز سے پوچھا۔ "مجاز کیا تمہارے والدین تمہاری رندانہ بے اعتدالیوں پر اعتراض نہیں کرتے۔"

"لوگوں کی اولاد سعادت مند ہوتی ہے جوش صاحب

مجاز نے نہایت متانت سے جواب دیتے ہوئے کہا "لیکن خوش قسمتی

سے میرے والدین بے حد سعادت مند ہیں۔"

——— مجاز اور فراق کے درمیان بڑی سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی۔ فراق نے اچانک مجاز کو چھیڑتے ہوئے کہا
"مجاز تم نے کباب بیچنے کیوں بند کر دیئے۔"
"آپ کے ہاں سے گوشت آنا جو بند ہو گیا" مجاز نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے فی الفور جواب دیا۔

——— جوش ملیح آبادی کو کہیں سفر پہ جانا تھا۔ جب جوش صاحب اسٹیشن پر پہونچے تو ان کی گاڑی چھوٹنے میں چند ہی منٹوں کی دیر تھی۔ مجاز اور کچھ دوسرے شاعر پہلے ہی پلیٹ فارم پر ریلوے بک اسٹال کے سامنے کھڑے تھے۔ جوش صاحب تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ان کے سامنے سے گزرے اور ان شاعروں کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے خاموشی سے آگے نکل گئے۔
ایک شاعر نے مجاز سے کہا۔ "یار اتنا عظیم شاعر اگر کسی دوسرے ملک میں ہوتا تو آج اس کے معتقد قطار در قطار اسٹیشن پر اس کو الوداع کہنے کے لئے آتے اور ہر شخص اپنے محبوب شاعر سے مصافحہ کرنے کی سعادت حاصل کرتا اور ——— "
اور اس دوران میں شاعر اعظم کی گاڑی دوسرے اسٹیشن تک پہونچ چکی ہوتی۔ مجاز نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

لطیفے

—— آموں کی ایک دعوت میں آم چوستے چوستے سردار جعفری نے مجازؔ سے کہا۔ "کیسے میٹھے آم ہیں مجاز روس میں اور تو ہر چیز مل جاتی ہوگی مگر ایسے میٹھے آم وہاں بھی کہاں۔"

"روس میں آم کی کیا ضرورت ہے۔" مجازؔ نے بلا تامل جواب دیا "وہاں عوام جو ہیں"۔

—— کسی جلسہ گاہ میں سردار جعفری اقبال کی شاعری پر تقریر کر رہے تھے۔ دوران تقریر میں ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جب سردار نے ایک دم یہ انکشاف کیا کہ اقبال بنیادی طور پر اشتراکی نقطۂ نظر کے شاعر تھے۔

تو مجمع میں سے کوئی مرد مومن چیختے ہوئے بولا۔ "جعفری صاحب آپ یہ کیا کفر فرما رہے ہیں۔ شاعر مشرق اور اشتراکیت —— لاحول ولا —— آپ اپنی اس خرافات سے اقبال کی روح کو تکلیف پہونچا رہے ہیں۔

اور جلسے کی پچھلی صفوں سے مجازؔ ایک پھل جھڑی کی طرح چھوٹتے ہوئے بولا "حضرت تکلیف تو آپ کی اپنی روح کو پہونچ رہی ہے جسے آپ غلطی سے اقبال کی سمجھ رہے ہیں"۔

—— حیات اللہ انصاری کے ساتھ چلتے چلتے مجازؔ اچانک کسی بنوا ڈن کی دکان کے سامنے رک گیا اور بے حد سنجیدگی اور احترام سے انصاری صاحب کو بنوا ڈن سے متعارف کراتے ہوئے کہنے لگا ——

"آپ لکھنؤ کے بہت وضع دار اور شریف آدمی ہیں۔ بڑے پڑھے لکھے نہایت عمدہ کہانیاں لکھتے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اردو کے ایک روزانہ پرچہ کے ایڈیٹر بھی ہیں ——— اور بہت دنوں دنوں سے یہ آپ سے ملنے کے آرزو مند تھے۔"

اور مجاز کے آخری جملے پر انصاری صاحب لاحول پڑھ کر اپنی خفت چھپانے لگے۔

——— ساغر نظامی ——— "مجاز میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے شعر کہنا کیوں چھوڑ دیا۔"

مجاز ——— "اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ برابر کیوں شعر کہے جا رہے ہیں" ——— "میں متواتر کئی سالوں سے شعر کہہ رہا ہوں اور یقیناً کئی مشہور شاعروں سے بہتر شعر کہہ چکا ہوں۔ اردو شاعری میں بے شمار کامیاب تجربے کئے ہیں۔ اور میرے متعدد منظوم شاہکار اردو ادب میں ایک تاریخی اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب یہ نقاد حضرات اردو شاعری کا جائزہ لینے لگتے ہیں تو مجھے فراموش کر دیتے ہیں۔" سلام مچھلی شہری نے نہایت جذباتی انداز میں بے حد مایوس ہو کر مجاز سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"تم کوئی غم نہ کرو ڈیئر سلام" مجاز نے اسے ڈھارس دیتے ہوئے کہا "بہت جلد وہ وقت آئے گا جب تمہاری ایک ایک نظم دنیا بھر کی متمدن زبانوں یعنی انگریزی فرانسیسی، روسی چینی اور

جاپانی میں ترجمہ کی جائے گی ـــــ اور پھر ـــــ"
"ـــــ اور پھر ـــــ" مجازؔ کے استخوانی جبڑے پر شوخی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی ـــ "اور پھر میں ان زبانوں سے تمہاری نظموں کا اردو نظم میں ترجمہ کروں گا۔ اور پھر یہ دنیائے ادب تمہارے اصلی مرتبے اور تمہاری صحیح عظمت کو تسلیم کرے گی"۔

ـــــ "دیکھو مجازؔ یہ بمبئی وی ٹی کا اسٹیشن ہے کتنی عالی شان عمارت ہے۔ کیسے بڑے بڑے کھلے اور روشن کمرے ہیں"۔
ساحرؔ نے اپنی پتلی پتلی لمبی لمبی انگلیوں کو فضا میں لہرا کر نہایت جذباتی ہوتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
"اور اسی بمبئی میں ہزاروں بلکہ لاکھوں مزدور کیڑوں مکوڑوں کی طرح تنگ و تاریک اور متعفن کھولیوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ انہیں رہنے کے لئے نہ جانے ایسے کمرے کب ملیں گے۔ مجازؔ نے اسی کے لب و لہجے میں اداس سا ہو کر کہا " ہاں یار ساحرؔ تم نے ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ ـــ

ریلوے والوں نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

ـــــ راجہ محمود آباد نے بڑے پیار سے مجازؔ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ـــ "مجازؔ اگر تم مان لو تو ایک بات کہوں"
مجازؔ سراپا انکسار بنتے ہوئے بولے "آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر

فرمائیے راجہ صاحب کیا ارشاد ہے۔"

"میں چاہتا ہوں تمہارے لئے دو سو روپئے ماہوار۔ وظیفہ مقرر کر دوں۔"

"بڑا کرم ہے حضور کا۔" مجاز نے اسی لب و لہجہ میں کہا۔

"لیکن —" راجہ صاحب نے ذرا سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم خدا کے لئے یہ شراب پینا ترک کر دو۔"

"شراب پینا ترک کر دوں —" مجاز نے نہایت حیرت اور بڑے بھولے پن سے راجہ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو پھر آپ کے دو سو روپے میرے کس کام آئیں گے۔"

— ایک مشاعرے میں مجاز انتہائی سرمستی اور مدہوشی میں اپنی نظم —

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواں ڈول

نہایت ٹھاٹ باٹ اور طمطراق سے پڑھ چکا تو ہنسراج رہبر نے نقرہ چست کیا کہ — مجاز صاحب کیا یہ نظم آپ نے شراب پی کر کہی تھی "

"بلکہ کہنے کے بعد بھی پی تھی" مجاز نے برجستہ جواب دیا۔

— مجاز سے کسی نے کہا — "حکومت ادیبوں کے لئے ایک علیحدہ کالونی بنا رہی ہے۔"

مجاز نے حیران ہو کر پوچھا۔ ڈسٹرکٹ جیل میں یا سنٹرل جیل میں۔"

—— ایک مشہور شاعر نے پریشان ہو کر کہا —— "میں شادی کرنا چاہتا ہوں مگر ——"

"مگر کیا" مجاز نے پوچھا۔

"مگر میں کسی بیوہ عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اور مجاز نے اس کی ذہنی پریشانی کا حل تجویز کرتے ہوئے کہا "قبلہ آپ کسی بھی لڑکی سی شادی کر لیجئے۔ بیوہ تو وہ ہو ہی جائے گی۔"

—— کسی مشاعرے میں مجاز غزل پڑھ رہا تھا کہ دفعتاً سامعین میں سے ایک خاتون کی گود میں اس کا شیر خوار بچہ زور زور سے چلانے لگا۔ مجاز اپنی غزل کے شعر کو ادھورا چھوڑتے ہوئے متعجب ہو کر پوچھنے لگا۔ ؏

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

—— حیدر آباد دکن میں "قاف" کی جگہ عام طور پہ لوگ "خ" بولتے ہیں۔ کسی حیدر آبادی نے مجاز کو ایک دعوت پر مدعو کرتے ہوئے کہا۔

"مجاز صاحب کل میری فلاں عزیزہ کی تخریب (تقریب) ہے غریب خانے پہ تشریف لائیے۔"

مجاز نے خوف زدہ ہو کر جواب دیا "نہیں صاحب مجھ سے یہ دردناک منظر نہیں دیکھا جائے گا۔"

لطیفے

—— مجاز جب رانچی کے دماغی شفاخانے سے کچھ ماہ بعد لوٹا تو کسی نے پوچھا "مجاز صاحب کیا واقعی آپ کی عقل زائل ہو گئی تھی۔"
مجاز نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "برادر عقل تھی ہی کہاں جو زائل ہوتی عقل ہوتی تو اس ملک میں شاعری کرتے۔"

—— مجاز تنہا کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب جو ان سے روشناس نہ تھے ان کے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھے۔ کافی کا آرڈر دے کر انہوں نے اپنی مدھم آواز میں گنگنانا شروع کیا——

احمقوں کی کمی نہیں غالب   ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں

مجاز نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ڈھونڈنے کی تو نوبت بھی کہاں آتی حضرت خود بخود تشریف لے آتے ہیں۔"

—— ہندو مسلم اتحاد پر ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ دوسرے شاعروں کے ساتھ جب مجاز مشاعرہ گاہ میں داخل ہونے لگا تو وہاں دروازے پر لکھا ہوا تھا۔ "مذہب کے نام پر لڑنا حماقت ہے۔"
مجاز نے ایک لمحہ اس عبارت پر نظر ڈالنے کے بعد کہا "اور حماقت کے نام پر لڑنا مذہب ہے۔"

—— کوئی صاحب مجاز کے سامنے غالب کا یہ شعر پڑھ رہے تھے

شمع جلتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

مجاز نے سر دھنتے ہوئے کہا "سبحان اللہ کیا شعر ہے۔ جل تو شمع رہی ہے اور دھواں "میں" کے اندر سے اٹھ رہا ہے"۔

—— ایک مشہور زبان داں اور پختہ مشق شاعر جو اپنی پیرانہ سالی کے باوجود مشاعروں میں انتہائی شوخی وطراری سے اپنا کلام پڑھتے ہیں۔ ایک بار کسی مشاعرے میں اپنی غزل سنا رہے تھے کہ نحیف و نزار جسم کی بار بار جنبش سے ان کے مصنوعی دانت ڈائس پر گر پڑے۔
مجاز نے یہ منظر دیکھ کر بلند آواز سے کہا "سنئے حضرات قبلہ شاعر صاحب خالص زبان کا شعر ارشاد فرما رہے ہیں"۔

—— مجاز اپنی نیم دیوانگی کے عالم میں ایک بار کسی مجلس وعظ میں پہونچ گئے تو ان کے کسی جاننے والے نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔
"حضرت مجاز —— آپ اور یہاں"
"جی ہاں" —— مجاز نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا —— "آدمی کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے"۔

—— مجاز اپنے ایک بہت بے تکلف دوست اور بہت بڑے شاعر کے ہاں مہمان تھے۔ ان کے شاعر دوست نے ایک کمسن سی بچی سے انھیں ملاتے ہوئے بتایا۔
مجاز یہ میری بھانجی ہے۔ بہت شریر ہے۔ کل دوپہر کو میں سو رہا تھا

کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ اسی حالت میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سرہانے کھڑی میری پیشانی کو سہلاتی ہوئی یہ بار بار کہہ رہی ہے۔

"پاجی ــــ پاجی"

مجاز نے بچی کے معصوم چہرے پہ اپنی مسکراتی ہوئی نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔" کافی مردم شناس بچی معلوم ہوتی ہے۔"

ــــ لکھنؤ کے کسی مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے جب جوش ملیح آبادی کار لے کر وہاں پہونچے تو مشاعرے کے گیٹ پہ ہی مجاز خیرمقدم کے لئے موجود تھا۔ جوش صاحب کار سے نکلے تو مجاز نے بہت نیازمندی سے مصافحہ کیا۔ اس کے بعد عرش ملسیانی بھی اس کار سے باہر آئے تو مجاز بولا "آہاہا عرش بھی ــــ"

اتنے میں مولانا بسمل شاہ جہاں پوری نے بھی اپنا بھاری بھرکم اور باریش چہرہ کار کی کھڑکی سے باہر نکالا تو مجاز نے کھلکھلاتے ہوئے اسی سانس میں جملہ پورا کر دیا

"اور معلّیٰ بھی ــــ

ــــ مجاز نے ایک صاحبِ ذوق خاتون کو اپنی شاعری کے بارے میں رائے دیتے ہوئے بتایا۔

"میں ڈکشن (Diction) کا ماسٹر ہوں۔"

"تو پھر جوش ملیح آبادی...... کیا ہیں۔" اس خاتون نے محض دل لگی کی خاطر مجاز سے سوال کیا۔

"ڈکشنری کے ماسٹر"۔

— ایک نوجوان شاعر نے کسی خاتون کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "مجاز صاحب مجھے اس سے نہایت شدید قسم کی محبت ہو گئی ہے۔ اس محبت نے میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ خدا کی قسم جب تک اس حسینہ کے متعلق چھ نظمیں نہیں کہہ لوں گا مجھے چین نہیں آئے گا۔"

مجاز نے فوراً فقرہ کسا۔ "اور ان نظموں کے بعد واللہ بے چاری کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔"

— میکدہ کی ایک شام —

شاعر کے حلق سے ابھی چند جرعے ہی اترے تھے کہ کسی ستم ظریف نے پوچھ لیا۔

"مجاز صاحب سرور آیا۔"

"جی نہیں ابھی تو آل احمد ہی آئے ہیں۔"

مجاز نے ہتی ساغر پر نگاہیں گاڑتے ہوئے برجستہ کہا۔

— ایک بار احتشام صاحب کسی کام سے ریڈیو اسٹیشن گئے وہاں مجاز بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد احتشام صاحب نے پوچھا

"مجاز تم یہاں کیسے آ گئے۔"

مجازؔ بہت سوکھا سا منہ بنا کر بولے ـــــ
(اس زمانے میں ان پر ریڈیو والوں کا عتاب نازل تھا)
"میں، تو یہاں بس آرٹ فار آرٹ سیک آجاتا ہوں"۔

ـــــ ایک بار مجازؔ کے پڑوس میں چوری ہوگئی۔ تفتیش کے لئے پولیس وغیرہ آئی۔ سارے محلے والے جمع ہو گئے۔ اس واردات کے موقع پر لوگ اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ صاحب خانہ بےچارے بہت پریشان تھے۔
مجازؔ نے ان بےچاروں سے اظہار افسوس کیا۔ اس کے بعد آپ ـــــ صاحب خانہ کو مجمع سے الگ دور لے گئے اور بہت ہی رازدارانہ انداز میں سوکھا سا منہ بنا کر بولے ـــــ
"بھئی ہو نہ ہو مجھے تو یہ کسی چور کی حرکت معلوم ہوتی ہے"۔

ایک بار کسی ادیب نے کہا:
"مجازؔ صاحب آپ نے شعروں سے زیادہ لطیفے کہنے شروع کر دیئے ہیں"۔
"تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے"۔
اور وہ ادیب مجازؔ کی اس بات پر واقعی گھبراتے ہوئے کہنے لگے:
"اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب کسی مشاعرے میں آپ شعر سنانے کے لئے کھڑے ہوں گے تو لوگ کہیں گے اپنے نئے لطیفے سنائیے"۔
"اور میں ان سے کہوں گا ـــــ مجازؔ نے بہت صفائی اور سادگی سے کہا
"شاعری بھی 'فنون لطیفہ' میں سے ہے"۔

لطیفے

گوالیار سے لکھنؤ آنے کے لئے اسٹیشن پر ویٹنگ روم میں بیٹھے جاں نثار اختر کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک صاحب آئے اور کسی قدر گھبراہٹ میں بولے ـــــ

"مجاز صاحب ٹرین آ رہی ہے۔"

"تو میں کیسے روک سکتا ہوں ـــــ؟"

مجاز نے سوکھے منہ جواب دیا۔

ایک بزرگ نے مجاز کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کسی ادبی نشست میں مدعو کیا اور کہا

"آپ کا آنا ضروری ہے، نشست زیادہ پُرتکلف نہیں ہے صرف چند طالب علم اور کچھ طالبات ہونگی۔"

مجاز نے وعدہ کر لیا، لیکن کچھ تاخیر سے پہنچے۔

ان بزرگ نے بڑھ کر مجاز کا استقبال کیا اور بولے۔

"آیئے مجاز صاحب! سب طالب علم آپ کا دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔"

اور طالبات؟"

مجاز نے جوتے کا تسمہ کھولتے ہوئے سوال کیا۔

بزرگ کچھ سٹپٹا سے گئے تو مجاز یکبارگی بول اُٹھے

"گھبرایئے نہیں! میں اپنے مطالبات ابھی پیش کر دوں گا۔"

۷ ۴ ۹ ۱ء میں جب پہلی بار آزادی کا جھنڈا لہرایا گیا تو اس پر اشوک چکر

لطیفے

بار دیکھ کر کسی نے مجاز سے پوچھا ــــــ

"حضرت یہ جھنڈے پر پہیا کیسا بنا ہے؟"

مجاز نے برجستہ جواب دیا ــــ

"بھئی! یہ فری انڈیا کا فری وہیل ہے۔"

لکھنؤ کا ایک چھوٹا سا ہوٹل جہاں مجاز کبھی کبھی شراب نوشی کے لئے پہونچ جایا کرتے تھے بند ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ اس کی عمارت میں کوئی سرکاری دفتر کھولا جا رہا ہے۔ یہ خبر سُنکر مجاز سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگے۔

"سُنتے ہیں پہلے زمانے میں دفتر بے معنی کو غرقِ مئے ناب کر دیا جاتا تھا۔ اور اب بے معنی دفتروں میں مئے ناب غرق ہو جاتی ہے۔"

سلام مچھلی شہری کو ایک زمانہ میں اپنے قریبی دوستوں کو طویل منظوم خط لکھنے کا بہت شوق تھا۔

کافی ہاؤس میں ان کی اس عادت کا تذکرہ ہو رہا تھا، وہاں ہندی کے ایک ادیب بھوتیشور صاحب بھی موجود تھے جن کا قد نہایت پستہ تھا۔ انہوں نے ازراہِ مذاق سلام سے پوچھا

"کیوں سلام صاحب آپ میرے نام طویل منظوم خط کب لکھیں گے۔"

سلام ابھی کچھ سوچ بھی نہ پائے تھے کہ مجاز نے جملہ سر کیا۔

"تمہیں اتنا لمبا خط لکھنا کیا ضرور، تمہارے لئے تو ایک پوسٹ کارڈ کافی ہوگا۔"

پچھلے دور کی بات ہے، لکھنؤ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسہ میں میراجی اپنی ایک نظم پڑھ رہے ہیں۔ دو صفحے پڑھ گئے، لیجیے، تیسرا صفحہ بھی ختم ہو گیا اور پھر چوتھا بھی۔

"یہ نظم کا ایک مصرع تھا"

میراجی نے اپنی زرد آنکھیں قدرے کھول کر سنجیدگی سے فرمایا۔

اور مجاز نے بے محابہ جواب دیا:

"تو اسے کسی مشاعرہ کی طرح کے لئے کیوں نہ دے دیجئے"

ایک زمانہ میں ایک سید صاحب سے کسی محترمہ کے دوستانہ تعلقات پر معتبر حلقوں میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

اسی اثنا میں ایک صاحب جو غالباً خود بھی ان محترمہ کے غائبانہ پرستار تھے۔ ان کی ایک تصویر مجاز کے پاس لائے اور کہنے لگے ___

"بھئی میں اس تصویر کو فریم کر کے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں تم اس پر کوئی چبھتا ہوا شعر لکھ دو ___"

مجاز نے فوراً اکبر کے اس مصرع کو یوں لکھ دیا۔

ع ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے۔

بمبئی کی ایک ادبی نشست میں اداکارہ نگار سلطانہ بھی موجود تھی مجاز اپنی نظم "شہر نگار" پڑھ رہے تھے لیکن جب اس مصرع پر آئے تو مسکرا دیئے ___ ع "میرے لب پر لبِ لعلینِ نگار آ ہی گیا"

مجاز کا مسکرانا تھا کہ محفل میں قہقہہ پڑ گیا۔

لطیفے

"حیدرآباد میں ترقی پسندوں کی کانفرنس تھی جس میں ڈاکٹر ملک راج آنند نے ایک بڑی لمبی چوڑی تقریر کی۔ دو گھنٹے گذر گئے مگر آنند اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ لوگ بیزار سے نظر آرہے تھے۔ مجاز پر تو غشی کا عالم طاری تھا۔ مگر خاموش بیٹھے کچھ دیر اور ہو گئی اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص سے بولے ــــ

"بڑا قابل آدمی معلوم ہوتا ہے!"

ایک سڑک پر سامنے سے کوئی بگڑے جنٹلمین الٹا ہیٹ پہنے چلے آرہے تھے جس کا پچھلا حصہ اگلی طرف تھا اور اگلا حصہ پچھلی طرف ــــ مجاز انھیں اس طرح دیکھ کر مسکرا دیئے اور اپنے ایک ساتھی سے کہنے لگے ــــ

"ذرا ان حضرت سے پوچھو کہ یہ آرہے ہیں یا جا رہے ہیں۔"

ان کے ایک دوست نے کہا

"مجاز میں شادی کرنا چاہتا ہوں؟"

"کر ڈالو۔"

"لیکن میں ایسی عورت چاہتا ہوں جو "وائف" اور محبوبہ دونوں کی جگہ پُر کر سکے۔"

"اچھا اچھا میں سمجھ گیا۔"

مجاز مسکرا کر بولے

"آپ کا مطلب "مڈ وائف" سے ہے۔"

سردار اچل سنگھ نامی ایک صاحب پنجاب سے جب نئے نئے لکھنؤ آئے تو ٹھیٹھ پنجابی تھے۔ ادبی ذوق تھا۔ اور لکھنؤ کے مشہور کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے، وہیں مجاز سے بھی رسم و راہ پیدا ہو گئی۔
کچھ عرصے بعد ان سردار جی کو لکھنؤ کی آب و ہوا کچھ ایسی راس آئی کہ انہوں نے اپنے کو صفاچٹ کروا دیا اور بالکل سپاٹ ہو کر کافی ہاؤس پہنچے۔
مجاز نے جو یہ حلیہ دیکھا تو حیرت سے بولے
"یا خدا، یہ پہلا سردار ہے جسے تو نے فارغ البالی عطا کی ہے۔"

جس زمانے میں کوریا میں جنگ ہو رہی تھی، ہندوستانی ادیبوں نے کوریا پر افسانے اور نظمیں لکھنا شروع کر دیئے اور اس ہنگامی موضوع پر خوب خوب قلم چلے۔
ایک صاحب نے مجاز سے کہا ــــ
"جناب کوریا پر کچھ لکھئے ــــ"
"کوریا پر؟" مجاز نے حیرت سے پوچھا۔
"جی ہاں ــــ"
"کاش کہ ایسا ہو سکتا ــــ" مجاز نے منہ لٹکا کر کہا۔
"کیوں ــــ"
مجاز نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولے ــــ
"ہائے افسوس، آج ہی گھر میں کوریا نہ ہوا۔"

مجاز کو کسی ادبی نشست میں پہنچنا تھا۔ وقت ابھی باقی تھا۔

ان کے ساتھ پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی تھے، جب کھڑے کھڑے باتیں کرتے ہوئے کچھ دیر ہوگئی تو رشید صاحب نے پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجاز سے کہا ــــ

"آپ تکلیف محسوس کر رہے ہوں گے آرام کرسی پر بیٹھ جایئے"

مجاز نے ادب کے ساتھ جواب دیا

"جی ہاں! مگر مجھے آرام کرسی پر تکلیف ہوتی ہے۔"

ایک ادب نواز مجسٹریٹ نے مجاز کو بستی آنے کی دعوت دی۔

مجاز نے کہا۔

"کچھ کام کی بات بھی ہوگی؟"

اُس نے جواب دیا۔

"تم آؤ تو، نہلا دوں گا۔"

مجاز مُسکرا کر بولے ــ

"خیر وہاں تم نہلا دو گے یہاں کم سے کم وضو تو کرا ہی دو!"

ایک بار مجاز یو پی سکریٹریٹ کے اطلاعات کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ شرما جی جن سے ان کی رسمی ملاقات تھی اور جن سے انھیں باتیں کرنا تھیں کسی موٹی سی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھے، کافی وقت گذر گیا مگر شرما جی کی ورق گردانی ختم نہیں ہوئی۔ آخر مجاز بور ہوتے ہوئے اس کتاب کی طرف بہت غور سے دیکھ کر بولے ــــ

"معلوم ہوتا ہے کوئی کتاب ہے؟ ــــ"

لطیفے

زہرہ انصاری سے ایک بار مجازؔ نے حیات اللہ انصاری کا تعارف کرایا۔ اس زمانے میں حیات اللہ "ہندوستان" اخبار کے اڈیٹر تھے۔

مجازؔ نے کہا ـــــ

"آپ ہندوستان کے اڈیٹر ہیں۔؟"

زہرہ نے زور دیکر کہا

"اچھا آپ ہندوستان کے اڈیٹر ہیں۔؟"

مجازؔ کو موقع مل گیا بولے ـــــ

"اگر آپ کاتب سمجھ رہی تھیں تو آپ کی بھول تھی۔

ایک صاحب نے بڑی شاہانہ طبیعت پائی تھی۔ جس فراخدلی سے وہ اپنا پیسہ خرچ کرتے تھے اسی وسیع قلبی کے ساتھ وہ دوسرے ہی سے پیسہ خرچ کروا لیتے تھے۔ ایک بار وہ مجازؔ سے بولے

"مجازؔ صاحب میں نے ایک دو نہیں بلکہ کتنے ہی لکھ پتی بنا کر چھوڑ دیئے۔"

"ہاں بھئی، مگر یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ وہ پہلے کروڑ پتی بھی تھے۔"

ایک روز میں نے کہا۔

"مجازؔ صاحب میں آپ کے لطیفے جمع کر رہا ہوں۔ کچھ اپنے لطیفے بتائیے۔"

مسکرا کر بولے ـــــ

"لیجئے۔ ایک لطیفہ تو یہی ہو گیا۔ آپ مجھ ہی سے میرے لطیفے پوچھ رہے ہیں۔"

مجاز لاہور گئے۔

فیض، ندیم اور دوسرے ادیبوں نے شہر اور اطراف شہر کی انھیں سیر کروائی۔ بالآخر مجاز کو وداع کرنے کا وقت آیا۔

فیض نے پوچھا۔۔

"مجاز صاحب آپ کو لاہور پسند آیا۔؟"

"ہاں بھئی شہر تو اچھا ہے۔ لیکن یہاں پنجابی بہت ہیں۔۔"

مجاز نے مخصوص سادگی سے جواب دیا۔

حیات اللہ انصاری نے بچوں کے لئے ایک قاعدہ لکھا۔ جس کی بڑی شہرت ہوئی۔ جدھر دیکھئے 'حیات اللہ قاعدہ'۔

مجاز نے کئی بار اس کا ذکر سنا۔ ایک دن جھنجلا کر بولے ۔۔

"کیا حیات نے اپنا تخلص قاعدہ رکھ لیا ہے ۔۔۔ ؟"

ایک بار مجاز علی گڑھ آئے، لڑکے ہوسٹل کے کسی کمرے میں پکڑ لے گئے۔ وہاں کچھ ثقہ قسم کے طالب علموں نے ان کی شراب نوشی پر نکتہ چینی شروع کی۔

ایک مولانا صاحب نے خالص عربی لہجہ میں سوال کیا۔۔

"آپ کی اس مذموم عادت کا آغاز کہاں ہوا؟"

"مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں"۔

مجاز نے انتہائی سادگی سے جواب دیا۔